اقبال شناسی اور قرآن

○

مرتّب

بیدار ملک

○

نظرِثانی

محمد عبداللہ قریشی

☆

بزمِ اقبال ○ کلب روڈ ○ لاہور

اقبال شناسی اور فاران

○

مرتب

بیدار ملک

○

نظر ثانی

محمد عبداللہ قریشی

☆

بزمِ اقبال ○ لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : نومبر ۱۹۸۸ء

تعداد : ۱۱۰۰

○

ناشر : ڈاکٹر وحید قریشی
اعزازی معتمد بزم اقبال ، ۲ ۔ کلب روڈ ۔ لاہور

مطبع : ظفر سنز پرنٹرز
۹ بی ، کوپر روڈ ، لاہور

طابع : سید ظفر الحسن رضوی

صفحات : ۱۲۸

قیمت : ۲۵ روپے

○

فہرست

عنوان　　　　　　　　　　　　　　صفحہ

۱ - دیباچہ　　　　مرتب　　　　۱

۲ - اقبال کی لفظی تصویر
پروفیسر حمید احمد خاں　　　　۳

۳ - اقبال — غزل سے فلسفہ تک
توقیر سلیم خاں　　　　۱۱

۴ - اقبال کا تصورِ معیشت
افتخار الحسن زاہد　　　　۲۳

۵ - اقبال کا تصورِ فن
مس خالدہ ناہید　　　　۳۱

۶ - علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج
ڈاکٹر وحید قریشی　　　　۳۹

۷ - کتابیاتِ اقبال　　　　بیدار ملک　　　　۴۴

8. Self in the Light of Relativity
Dr. Sir Sh. Muhammad Iqbal　　　　1

9. The Reconstruction of Thought in Iqbal.
Prof. Irshad-ul-Hasan　　　　8

10. The Universal Note in Iqbal's Poetry.
Prof. Hamid Ahmad Khan　　　　25

11. Wordworth & Iqbal.
Muhammad Siddiq　　　　47

12. Contradictions in Iqbal's Thought.
Bedar Malik　　　　71

انتساب

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

(اقبالؒ)

دیباچہ

اسلامیہ کالج سول لائنز ، لاہور دراصل شہر لاہور میں بڑھتے ہوئے علمی تقاضوں کی ایک توسیع تھی - ۵۴ - ۱۹۵۳ء میں برِ صغیر کی عظیم درس گاہ اسلامیہ کالج ، طلباء کی تعداد کے زیادہ ہونے کے باعث ڈی - اے - وی کالج کی متروکہ عمارت میں چلی گئی تھی ، لیکن اس میں بعض اوقات ایک یا دو ادارے بیک وقت سامنے رہے - ۱۹۶۹ء میں جب یہ عمارت پورے طور پر انجمن حمایت اسلام کی تحویل میں آ گئی تو اسے ایک الگ کالج کا درجہ دیا گیا اور وطنِ عزیز کے ایک گراں مایہ ماہرِ تعلیم ادیب اور نقاد جناب پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم اس کالج کے پہلے پرنسپل بنے - انھوں نے اس کالج کی بنیاد اپنے اعلیٰ علمی قد کاٹھ کے مطابق بڑے عظیم الشان طریقے سے رکھی - جہاں پر انھوں نے نامور اساتذہ کی ایک کہکشاں کے ساتھ یہاں علم و ادب پھیلایا وہاں پر انھوں نے اسلامیہ کالج لاہور سے لائبریری تک کے بیشتر نوادرات سمیٹ کر اسلامیہ کالج سول لائنز میں جمع کر لیے -

جونہی کالج کی علمی ، ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا - انھوں نے مجلہ ''فاران'' کا آغاز کر دیا - یہ ان کا فیضان نظر تھا کہ اس مجلے کا علمی اور ادبی معیار ملک کے دوسرے رسالوں سے کسی طور کم نہ تھا - راقم نے اُستاد گرامی جناب ڈاکٹر وحید قریشی ، سیکرٹری بزمِ اقبال ، کے حکم پر ''فاران'' میں شائع شدہ اقبالیات پر مضامین کو ترتیب دیا ہے جن کو پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے فاضل اساتذہ اور ان کے ہونہار طلباء نے علامہ اقبال سے متعلق متنوع موضوعات پر تحقیق اور اظہارِ خیال کیا ہے - بعض مضامین اپنے معیار کے اعتبار سے بہت ہی بلند پایہ ہیں ، لیکن چونکہ طلباء کی نگارشات بھی ان میں شامل ہیں ،

جن میں ایسی گہرائی تو نہیں جیسی اساتذہ اور دیگر علمی، ادبی شخصیات کی تحریروں میں ہے لیکن ان کا جذبہ شوق اور کاوش یقیناً قابلِ ستائش ہے ۔ راقم کو یقین ہے کہ قاری اس کتاب سے یقیناً مستفید ہوں گے ۔

اس مجموعے کی ترتیب کے دوران مجھے محمد عبداللہ قریشی اور محترم ڈاکٹر وحید قریشی کی مسلسل رہنمائی حاصل رہی ۔ اس کے علاوہ میرے رفیق کار علی جاوید نقوی ، جو اسلامیہ کالج سول لائنز کے ہونہار طالب علم رہے ہیں اور مجلہ ''فاران'' کے عملہ سے بھی وابستہ رہے ہیں ، نے بہت پُرخلوص محنت کی اور کالج کی لائبریری سے تمام مواد تلاش کرنے میں میری مدد کی ۔ ان کے علاوہ میرے دفتر کے اردو ٹائپسٹ جناب بشیر احمد نے بھی بہت قابلِ قدر خدمت انجام دی ۔ اس کے لیے میں ان سب حضرات کا ممنون ہوں ۔

لاہور — بیدار ملک

پروفیسر حمید احمد خان

اقبال کی لفظی تصویر

ہر بڑے آدمی کا نام ایک طلسم ہے جسے زبان پر لاتے ہی نظر کے سامنے ایک نیا جہان ابھرتا ہے۔

محمد اقبال! یہ نام پچھلی صدی تک کسی خاص مفہوم سے آشنا نہ تھا۔ ہزاروں دوسرے ناموں کی طرح یہ بھی ایک نام تھا۔ غیر متحرک اور منجمد جیسے زید اور بکر اور عمرو! آخرکار صدیوں کی بے سروسامانی کے بعد خود ہمارے عہد میں اس نام نے حیاتِ جاوید کا خلعت پہنا۔ اس کو زندہ کرنے کے لیے ایک مسیح آیا اور یہ نام علامت قرار پایا فلسفۂ زندگی کی ایک ہمہ گیر حرکت اور وسعت اور اضطراب کی۔ آنے والی نسلیں اس نام کے پیچھے صرف اسی حرکت اور وسعت اور اضطراب کی جھپٹ دیکھیں گی۔

لیکن موجودہ نسل جب اس نام کو سنتی ہے تو زندگی کے اس طوفان انگیز تخیل کے پیچھے اسے ایک پرسکون اور عزلت پسند انسانی پیکر کی تصویر نظر آتی ہے۔ محمد اقبال! پیغمبرِ امید، پیغمبرِ حیات، بے شک! مگر اس سے پہلے ہماری طرح ہنسنے بولنے والا، کھانے پینے والا ایک انسان! جب تک موجودہ نسل زندہ ہے یہ متحرک شبیہ اس کے تصور میں موجود رہے گی۔ لیکن اس نسل کے گزر جانے کے ساتھ عالمِ خیال کی یہ تصویر بھی گزر جائے گی۔

اقبال کے سراپا کی لفظی تصویر کھینچنا آسان نہیں۔ اگر انہیں کشیدہ قامت کہا جائے تو یہ کچھ مبالغہ سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہیں میانہ قد کہنا صریحاً کوتاہی ہوگی۔ یہی حال ان کے

ڈیل ڈول کا تھا - ان کا جسم بھرا بھرا تھا ، مگر فربہی کے شبہ سے پاک - چنانچہ جب گرمی کے موسم میں باتیں کرتے کرتے پنڈلی پر سے کپڑا ہٹا دیتے تھے تو اہلِ مجلس کو تعجب سا ہوتا تھا کہ ان کی پنڈلیوں پر کچھ زائد گوشت کیوں نظر نہیں آتا - یہ اس لیے کہ ان کے پُر رعب چہرے کا لحاظ کر کے دیکھنے والا قدرتی طور پر زیادہ پُرگوشت اور بھری ہوئی پنڈلیوں کی توقع رکھتا تھا - ان کا رنگ گورا تھا جس میں سرخی کی جھلک آخری دنوں تک قائم رہی - مرض کی حالت سے قطع نظر ان کے چہرے کی سرخی روشنی اور دھوپ میں خاص طور پر نمایاں ہو جاتی تھی - یہ گویا ان کے اس کشمیری خون کا اثر تھا جو ان کے شفاف خدوخال سے چھپائے نہیں چھپتا تھا -

اقبال اپنے سر کے بال سنوارنے میں صرف یہ کرتے تھے کہ انھیں کنگھی سے سلجھا کر پیچھے ہٹا دیتے تھے - کم از کم میں نے ان کے بالوں میں کبھی مانگ نہیں دیکھی - باتیں کرتے ہوئے کبھی کبھی اپنا ہاتھ اسی انداز سے بالوں پر پھیر لیا کرتے تھے - پیشانی اگرچہ کشادہ تھی مگر جہاں سر کے بال شروع ہوتے تھے وہاں کچھ تنگ تنگ بلکہ ایک گوشہ بناتی ہوئی معلوم ہوتی تھی - ابرو بہت گھنے تھے اور اس لیے کچھ گھنے معلوم ہوتے تھے کہ ان کے نیچے آنکھیں گہری بلکہ ذرا اندر کو دبی ہوئی معلوم ہوتی تھیں - ان کی آنکھیں بڑی نہ تھیں مگر گہری اور ذہین آنکھیں ضرور تھیں - جن کے اوپر گھنے ابروؤں کے چھجے جھکے ہوئے تھے - گفتگو کرتے وقت ان کی صرف دائیں آنکھ کھلی رہتی تھی - دوسری آنکھ کو نادانستہ طور پر ذرا بند کرتے رہتے تھے - دراصل ان کی یہ آنکھ بینائی سے بالکل محروم تھی -

اقبال داڑھی عمر بھر منڈاتے رہے - لیکن مونچھیں رکھتے تھے - مونچھیں رکھنے کے بھی کئی فیشن ہیں - ہماری سوسائٹی میں بعض حضرات صرف اپنی ''زور دار'' مونچھوں کے دم خم سے پہچانے جاتے ہیں - اقبال کا تعلق اس گروہ سے نہیں تھا ، ان کی مونچھیں ذرا چھدری تھیں اور خاموش - مگر اس خاموشی کے باوجود جان دار معلوم ہوتی تھیں - یوں سمجھ لیجئے کہ اقبال کی مونچھوں میں اگر قیصر ولیم کی اکڑ نہیں تھی تو چیمبرلین کی مونچھوں کا عجز و انکسار بھی نہ تھا -

یہ ایک دلچسپ سوال ہے کہ جو لوگ اقبال کے پاس بیٹھتے تھے ان پر اقبال کی شخصیت کا مجموعی طور پر کیا اثر ہوتا تھا ؟ ہم اپنی جان پہچان کے لوگوں میں سے ہر ایک کے ساتھ بالعموم ایک نہ ایک ایسی خصوصیت منسوب کر دیتے ہیں جو ہمارے نزدیک اس کی شخصیت کی امتیازی نشانی بن جاتی ہے ۔ اگر ایک شخص بالطبع خاموش ہے تو دوسرا باتونی ہے ۔ ایک کا کام دن رات ہنسی ، دل لگی ہے ، دوسرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے ، غرض کوئی نہ کوئی نمایاں صفت ایسی ہوتی ہے جسے ہم اس کی شخصیت قرار دیتے ہیں ۔ اقبال کو میں نے بارہا ہنستے دیکھا ہے اور کبھی کبھی غصے کی حالت میں بھی ۔ لیکن ان کی شخصیت کا محور نہ ہنسی تھی اور نہ غصہ ۔ انسان پر بہت سی ذہنی اور جسمانی کیفیتیں طاری ہوتی ہیں ۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی زندگی میں غور و فکر کو جو مرکزی حیثیت حاصل تھی وہ کسی اور کیفیت کو کبھی حاصل نہیں ہوئی ۔ خاموشی اور گفتگو ، سکون اور اشتعال ہر رنگ میں ان کی اصل حیثیت ایک مفکر کی تھی ۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی شخص تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھے اور یہ محسوس نہ کرے کہ اقبال کی پوری ہستی کی بنیاد غورِ و فکر پر قائم ہے ۔ گفتگو میں ذرا وقفہ آیا اور اقبال کا ذہن ایک جست میں کائنات کی حدوں کو عبور کر کے وہاں جا پہنچا جہاں ہمارا شور و شغب قدرت کے سرمدی سکوت میں گم ہو جاتا ہے ۔ اس وقت دیکھنے والے کو صرف ایک نظر بتا دیتی کہ یہ اپنے آپ میں سمٹا ہوا انسان سیاسی پلیٹ فارم کی تقریر شرر بار اور منبر کے وعظ ستم اندوز کے لیے پیدا نہیں ہوا ۔ اس وقت اس کا پیکرِ خاک اسی عالمِ رنگ و بو میں موجود ہوتا ، لیکن اس کی روح ستاروں کے نور سے اُلجھتی ہوئی ، پاتال کے اندھیرے سے ٹکراتی ہوئی ، کسی نئی دنیا میں جا نکلتی ۔

مگر اقبال کی اس حیاتِ فکری کا ایک پہلو اور بھی تھا ۔ اپنے ذہن کی اسی کیفیت کی وجہ سے اقبال عام انسانی تعلقات سے بے نیاز تھے ، اپنے ملنے والوں سے ان کا تعلق معاشرتی تعلق نہیں تھا ، فلسفیانہ تھا ۔ میں برسوں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا لیکن مجھے پورے عجز کے ساتھ اعتراف ہے کہ انہیں مجھ سے کوئی ذاتی تعلق نہیں تھا ۔ میں تو خیر ایک

عقیدت مند کی حیثیت سے ان کے پاس جاتا تھا ان کے مقربین بھی ان کے دلی تعلق سے غالباً محروم تھے۔ جب اقبال خلوص اور گرمجوشی سے بات کرتے تھے تو اس لیے نہیں کہ ان کا مخاطب ان کے اس اخلاص کا مستحق ہوتا بلکہ اس لیے کہ وہ تمام جوش اور خلوص انھیں اپنے اس خیال کے متعلق محسوس ہوتا جس کے اظہار سے انھیں غرض ہوتی۔ جن لوگوں سے اقبال بے تکلف تھے وہ لوگ بھی روحانی طور پر ان کے لیے اشخاص نہیں تھے بلکہ محض کھونٹیاں جن پر مختلف قسم کے خیالات بالکل مناسب طور پر لٹکائے جا سکتے تھے۔ اقبال اس معاملے میں ہمیشہ تنہا اور آزاد رہے۔ روح کی اس تنہائی کے باوجود اقبال کو ایک مختصر حلقے کی گفتگو اور وہاں اپنے خیالات کے اظہار میں خاص لطف آتا تھا، وہ خود بھی خاموش رہ کر دوسروں کی بات سن سکتے تھے اور انھیں باتونی کہنا تو کسی طرح بھی درست نہ ہوگا لیکن مختلف سوالات کے جواب میں اپنی تشریحات پیش کرتے ہوئے جو لذت انھیں ملتی تھی وہ ہر شخص پر ظاہر تھی۔ دراصل ان کی فطرت مشرق وضع کے پرانے اُستاد کی فطرت تھی جس کا محبوب ترین مشغلہ اپنے شاگردوں کے درمیان بیٹھ کر بات بات میں نکتے پیدا کرنا تھا۔

آج وہ شمع خاموش ہے اور وہ محفل بھی باقی نہیں رہی لیکن ہمارا تخیل اس مٹتی ہوئی تصویر کو ایک بار پھر زندہ کر سکتا ہے۔ آئیے پھر ایک مرتبہ ڈاکٹر اقبال سے ملنے چلیں۔ میکلوڈ روڈ سے مڑتے ہی ڈاکٹر صاحب اپنی کوٹھی کے برآمدہ میں آرام کرسی پر بے تکلفی سے بیٹھے نظر آتے ہیں، اگر سردی کا موسم ہے تو ڈاکٹر صاحب قمیض اور شلوار میں ملبوس ایک بادامی دھسہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ اگر گرمی ہے تو قمیض کے ساتھ ایک دھوتی ہے اور قمیض کی بجائے کئی مرتبہ صرف بنیان ہی ہے۔ آرام کرسی پر ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھے ہیں اور کبھی کبھی اپنے پاؤں کے بے حد سفید تلوے کو سہلا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی آرام کرسی کے ساتھ ہی حقہ پڑا ہے۔ چلم بجھ جاتی ہے تو ایک ایسے انداز میں جو کبھی نہیں بدلا، آواز دیتے ہیں ''علی بخش''! اتنے میں ہم برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہیں اور سلام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر کے لیے ادھر توجہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ''آؤ جی — صاحب!'' جس شخص کو اچھی

طرح پہچانتے ہیں، اس کا خیر مقدم اسی مختصر جملے سے کرتے ہیں - جس کو نہیں پہچانتے اس کے متعلق کبھی نہیں پوچھتے کہ یہ کون ہے - ناواقفوں کے لیے یہی کافی ہے کہ سلام کریں اور بیٹھ جائیں - اس کے بعد تکلف برطرف وہ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو میں پوری آزادی سے شامل ہو جاتے ہیں -

اب باتیں شروع ہوتی ہیں اور علم و حکمت کا چشمہ آبلنے لگتا ہے - ڈاکٹر صاحب کے دماغ میں ہر رنگ کی موج آٹھتی ہے اور اجنبی چہروں کا سامنا بھی ان کی گفتگو کی بے باک روانی کو کسی زنجیر کا پابند نہیں کرسکتا - ان کی تشریحات آستادانہ ہیں - وہ سوالات کا جواب دینے سے تھکتے نہیں بلکہ ایک ایک نکتہ کھول کھول کر بیان کرتے ہیں - کچھ سمجھاتے ہیں تو ہاتھ کی صرف ایک انگلی ہی نہیں اٹھاتے بلکہ داہنے ہاتھ کا پورا پنجہ حرکت میں آتا ہے - گفتگو ہمیشہ پنجابی میں ہوتی ہے - کبھی کسی علمی نکتے کے بیان میں انگریزی کے دو ایک جملے بھی بے تکلف استعمال کر جاتے ہیں - اردو میں صرف اس وقت بات چیت کرتے ہیں، جب بیرونِ پنجاب سے کوئی صاحب شریکِ مجلس ہوں - مذہب اور سیاست دو ایسے مضمون ہیں جن سے بحث کرتے ہوئے کبھی کبھی ان کا لہجہ پُرجوش ہو جاتا ہے - جوں ہی کوئی ایسا موقع آتا ہے ڈاکٹر صاحب کرسی پر ذرا سیدھے ہو بیٹھتے ہیں - یہ میکلوڈ روڈ کے دنوں کی کیفیت ہے - میو روڈ کی کوٹھی کے زمانے میں امراض نے آ گھیرا ہے، بستر پر لیٹے رہتے ہیں اور ملاقاتیوں کو خواب گاہ ہی میں بلا لیتے ہیں - اسی حالت میں گھنٹوں تک پُرلطف باتیں ہوتی ہیں - لیکن جوں ہی گفتگو میں ذرا گرمی پیدا ہوئی، ڈاکٹر صاحب ایک دم اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئے اور پھر اس وقت تک نہیں لیٹے جب تک وہ بات ختم نہیں ہو گئی -

اب ہمیں ان کے پاس بیٹھے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا ہے، ہمارے سوالات ختم ہو چکے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کا ذہن بھی ایک اور پرواز کے لیے ذرا دم لیتا ہے، دونوں طرف خاموشی طاری ہو جاتی ہے - اس وقت ڈاکٹر صاحب ایک اور ہی عالم میں ہیں، وہ کمرے میں موجود ہیں، مگر پھر بھی موجود نہیں ہیں - ان کی ظاہر کی آنکھیں کچھ بند کچھ کھلی ہیں - لیکن باطن کی آنکھ کسی اور سمت میں سراپا نگاہ ہو رہی ہے -

اسی کیفیت میں کچھ وقت گزر جاتا ہے ۔ ان کے خیالات کی موجیں انھیں کہاں سے کہاں لے جاتی ہیں ۔ آخر کار حواسِ ظاہری کا دید بان دفعتاً واپسی کا اشارہ کرتا ہے اور ان کا سفینۂ خیال گہرے سمندروں کے سفر کے بعد پھر زندگی کے پرانے ساحلوں کی طرف رخ پھیرتا ہے ۔ اس وقت وہ اپنا سر ذرا اوپر کو اٹھاتے ہیں اور ان کے منہ سے کبھی ''یا اللہ'' ! اور کبھی فقط ''ہوں !'' کی ہلکی سی آواز نکلتی ہے ۔ یہ آواز اس بات کی علامت ہے کہ جہاز ساحل پر آ پہنچا اور اس کے لنگر کا قلابہ پھر ایک بار عالم اسباب کی مضبوط زمین میں پیوست ہو گیا ۔ اس قسم کے وقفوں کے بعد بالعموم ان کی یہی لمبی اور پرسکون ''ہوں !'' ان کے ذہن کی دور و دراز اڑان سے ان کی بازگشت کی نقیب ہوتی ہے ۔ پھر اسی پہلے انہاک سے باتیں شروع ہو جاتی ہیں ۔ تاآنکہ سہ پہر کے سائے ڈھل کر شام میں غائب ہونے لگتے ہیں اور سورج غروب ہو جاتا ہے ۔ آخر ہم اپنی کرسیوں پر ایک بے معنی سی جنبش کرتے ہیں اور پھر اٹھ کر اجازت چاہتے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں ''اچھا چلتے ہیں آپ ؟'' اور پھر ہمارے سلام کا جواب ہاتھ اٹھا کر دیتے ہیں ۔ یہ ان کا ہمیشہ کا معمول تھا ۔

ڈاکٹر صاحب نے جب رحلت کی تو اہلِ لاہور کو جو ہر وقت ان سے شرف ملاقات حاصل کر سکتے تھے ایک ایسا شخصی نقصان پہنچا جس کی تلافی خود ڈاکٹر صاحب کا کلام بھی نہیں کر سکتا تھا ۔ ان کے انتقال کے موقع پر میں اتفاق سے لاہور میں موجود نہیں تھا ۔ میرے ایک دوست[۱] نے جن کے ساتھ مل کر میں بارہا ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا مجھے ایک خط لکھا جس میں لاہور کی زبان بن کر انھوں نے وہ جذبات قلمبند کر دیے جو بہت سے دلوں کو بے تاب کر رہے تھے ، مگر لب تک نہیں آ سکے تھے ۔ انھوں نے لکھا :

''ڈاکٹر اقبال چل بسے ، افسوس کہ ہمیں آخری دنوں میں ان کا دیدار حاصل نہ ہو سکا ۔ یہ حسرت ہمیشہ میرے دل میں رہے گی ۔

۱۔ پروفیسر عبدالواحد ایم ۔ اے ، سابق لیکچرار ، اسلامیہ کالج ، لاہور ۔

لوگ کہتے ہیں کہ اقبال مرا نہیں ۔ کیوں کہ اس کا کلام اسے زندہ جاوید بنانے کے لیے کافی ہے لیکن میں اس سے متفق نہیں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کے کلام میں اس کی مکمل شخصیت دکھائی نہیں دیتی ۔ اس کی نظم تو انسانی زندگی کی اعلیٰ ترین قدور سے موزوں (یعنی پُر معنی اور متین) زبان میں بحث کرتی ہے ۔ لیکن خود اقبال کی شخصیت کا ایک اور دلچسپ پہلو بھی تھا یعنی اس کی خوش کلامی جو بعض دفعہ بذلہ سنجی سے جا ملتی تھی ۔ اس کی نظم میں تو اس کا تخیل عرش بریں کو اپنی بلند پروازی کی پہلی سیڑھی سمجھتا ہے ۔ لیکن کیا ہم نے اس کو اپنی زندگی میں بے علموں اور وہم پرستوں سے انھیں کی سطح پر نہایت انہاک سے بحثیں کرتے ہوئے نہیں دیکھا ؟ اس کے کلام سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ''دانائے راز'' سے ہم سخن ہونا مجھ جیسے ہیچمدان کے بس کی بات نہ تھی ۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں نے گھنٹوں اس کی صحبت میں بصیرت افروز باتیں سنتے ہوئے گزار دیے ۔ مگر اللہ کے بندے نے کبھی ایک دفعہ بھی اشارے یا کنائے سے یہ جتانے کی کوشش نہ کی کہ تمھاری تنگ نظری وبالِ جان ہو رہی ہے ۔ اب ختم بھی کرو ۔ الغرض وہ اقبال جو لوگوں سے گویا پکار پکار کر کہتا تھا کہ آؤ میرے علم و فضل کے خزانے کھلے پڑے ہیں جھولیاں بھر بھر کر لے جاؤ ، مر گیا ہے ۔ اقبال کا کلام برحق ، لیکن ہم اپنے بظاہر لاینحل مسئلوں کو اب کس کے پاس لے جائیں گے تا کہ وہ ایک جنبشِ لب سے مشکل گتھی کو سلجھا دے ۔ یہ اقبال مر گیا ہے ۔ افسوس !''

☆ ☆ ☆

توقیر سلیم خان

اقبال - غزل سے فلسفہ تک

"کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان پھر وجود میں آئیں گے اور ادب اردو کے فروغ کا باعث ہوں گے۔ مگر زبان اردو کی خوش اقبالی دیکھیے کہ اس زمانے میں اقبال سا شاعر اسے نصیب ہوا۔ جس سے اس کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی اردو داں دنیا کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم و ایران بلکہ فرنگستان تک پہنچ چکی ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباس حکیم الامت، ترجمان حقیقت، شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال کے سب سے پہلے مجموعۂ کلام "بانگ درا" کے دیباچہ سے ماخوذ ہے۔ مزید لکھا گیا ہے کہ اردو اور فارسی شاعری کی جس قدر غالب نے آب یاری کی، وہی روح اقبال کے جسد خاکی نے پائی اور یوں پنجاب کے ایک گوشہ، جسے سیالکوٹ کہتے ہیں، وہاں پر ایک مرد قلندر اقبال پیدا ہوا۔

یہ تعریفی کلمات اس دور کے ہیں، جب اقبال نے باذوق قارئین کو چند جواہر پارے دکھائے۔ انھوں نے ان جواہر پاروں کو اس دور کے سب سے عظیم اور اپنے فن میں یکتا و بے مثل شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب کے جواہر پاروں کی کسوٹی پر پرکھا مگر حیرت سی حیرت کہ لوگ جسے کسوٹی پر پرکھ رہے تھے وہ خود کسوٹی تھی۔

تاہم یہاں پر نہ تو اقبال اور غالب میں موازنہ مقصود ہے، اور نہ ہی یہ کہ اقبال کے بچپن، جوانی یا وقت پیری کے حالات بیان کیے جائیں۔

یہاں ہم سب سے پہلے اس سوال کا جواب تلاش کریں گے کہ اقبال نے شاعری میں کون کون سی ارتقائی منزلیں سر کیں ؟ دوئم یہ کہ اقبال فلسفی تھے یا شاعر یا اُنھوں نے اپنے فلسفے کی خاطر شاعری کی ؟ سوئم یہ کہ کیا آپ کا نظریۂ خودی جو تمام اُردو فارسی کلام میں چھایا ہوا نظر آتا ہے ، آپ کو شاعری کے میدان میں لے آیا ؟ چہارم یہ کہ کیا اقبال نے غزل کے اندر انداز تغزل کو قائم رکھا یا اُس میں نظم کے مطالب و مضامین لایا ؟

اس کے بعد یہ کہ کیا اقبال نے حکمائے فرنگ کے افکار و نظریات کو تسلیم کیا ؟ کیا اُنھوں نے مغربی فلسفہ کو اپنایا یا اپنے لیے ایک الگ راہ متعین کی ؟ اس کے علاوہ اقبال کا فلسفۂ غم ، اقبال کا تصورِ خودی ، علم و حکمت ، یہ حقائق و معارف کی ترجمانی ، سیاست و معشیت کے مضامین ہیں جو اپنے اندر ایک علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں ۔

یہ سوال جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے ، ان کے جواب کے لیے بہت تفصیل درکار ہے ، اور ان پر کئی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جا سکتی ہیں ۔ مگر ہم یہاں پر صرف ایک سرسری نظر سے ان کا مطالعہ کریں گے ۔

حضرت علامہ اقبال کے دور میں جن شعراء کو اُردو شاعری میں منصبِ عالی نصیب ہوا ، اُن میں انیس ، غالب ، اکبر اور حالی کے نام قابلِ ذکر ہیں ۔ اس کے بعد داغ ہیں ، جن سے اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دنوں میں اصلاح بھی لی ۔

جہاں تک ان سب شعراء حضرات کا تعلق اقبال سے ہے وہ یہ ہے کہ اقبال پر ان شعراء کا اثر شروع شروع میں رہا ۔ اس طرح اقبال نے اپنی نو مشقی اور تقلید کے دور سے گزر کر اپنے لیے ایک الگ اور جدا راستہ نکالا جو اُنھیں ایسی منزل پر لے جاتا تھا ، جس کا کوئی شریک نہیں ۔ آج زمانے میں جو عزت اقبال کو نصیب ہے وہ ان شعراء حضرات کو نصیب نہ ہوئی ۔ اس کے باوجود اقبال نے سدا اپنے پیش رووں کی بڑائی کا اعتراف کیا ۔ یہی علامہ کی بڑائی کی دلیل ہے ۔

دنیا میں ہمیشہ سے یہی دیکھا گیا ہے کہ کم ظرف اور تہی مغز لوگ اپنی ثنا آپ کرتے ہیں ، اور دوسری طرف اوروں کی بڑائی کو تسلیم کرتے ہوئے جھجھکتے ہیں ۔ اوچھے لوگ اپنے محسنوں کو بھلا دیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنے پیش روؤں غالب ، داغ ، حالی اور فارسی کے بڑے بڑے شعراء کی بڑائی کو مانا اور اُن کی تعریف کی ہے ۔ اس تعریف میں ایسے شاعر بے شمار ہیں ، جن کی کتابوں سے اقبال نے فیض حاصل کیا ۔ مثلاً حضرت رومی ، شیخ سعدی وغیرہ ۔ اقبال نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ تعصب سے قطع نظر انگریز اور ہندو شعرا کی تعریف میں نظمیں کہیں ۔

بہرحال جن دنوں اقبال نے شاعری شروع کی اُن دنوں اکبر ، حالی اور داغ کا خاص کر چرچا تھا ۔ اقبال کو اپنی شاعرانہ صلاحیت کا احساس ہوا تو آپ نے اُردو کے تمام ہونہار شاعروں کی طرح پہلے پہل غزل گوئی سے شاعری کی ابتداء کی ۔ ابتداء میں داغ سے اصلاح لی ۔ خط و کتابت کے ذریعے یہ سلسلہ جاری رہا ۔ آخر کو داغ نے سیر چشمی سے کام لے کر ہمت بندھائی اور لکھا کہ تمھیں اب اصلاح کی ضرورت نہیں ۔ جو جوہرِ قابل ہو وہ اپنی حیثیت خود منوا لیتا ہے ۔ آخر کار ایسا ہی ہوا ۔

اُس وقت اقبال بی ۔ اے میں پڑھتے تھے ۔ لاہور میں ایک خاص مشاعرہ منعقد ہوا ۔ جس کی صدارت میر گورگانی نے کی ۔ اس میں اقبال نے اپنے چند دوستوں کے مجبور کرنے پر اپنی غزل کا یہ شعر سنایا :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

یہ شعر سن کر حاضرین خاص کر میر مشاعرہ پھڑک اُٹھے ۔ یہ شعر اس بات کا آئینہ دار تھا کہ کہنے والا مستقبل میں ایک بڑا شاعر ثابت ہو گا اسے اپنے آپ پر کس قدر بھروسہ ہے ۔ اس شعر کی وضاحت مندرجہ بالا شعر کے مقطع سے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے :

اقبال کو لکھنؤ سے نہ دہلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

یہ پیمبرانہ الفاظ جو ایک فیضانی کیفیت میں اقبال کی زبان سے نکلے اُس وقت کے سننے والوں کے نزدیک محض شاعرانہ بڑ اور چرب زبانی کے مصداق ہوں گے ۔ لیکن یہ وہ اقبال تھا جس کی شہرت ہندوستان سے باہر دور دور تک پھیل گئی اور یہ ثابت کر دکھایا کہ زبان دانی کا علم ہر کوئی ہر کہیں حاصل کر سکتا ہے ۔

اقبال نے جس دور میں شاعری کی ابتداء کی اُس وقت ہندوستان کی سیاسی فضا قومیت اور آزادی کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہی تھی ۔ مسلمان ابھی تک خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوئے تھے ۔ قریب تھا کہ ہندو اور انگریز سامراج انھیں نگل لیتے ۔ سرسید کی پُرخلوص کوششیں رنگ لائیں ۔ حالی کی نوحہ خوانی نے کچھ رنگ دکھایا ۔ لیکن ابھی تک روح کو تڑپانے والی اور قلب کو گرمانے والی آواز فضا میں پیدا نہ ہوئی تھی ۔ بہرحال اس سیاسی تذبذب اور انتشار کے دور میں اقبال نے جن نظموں سے اپنی قوم کو جھنجھوڑا ، ان میں ۱۹۰۵ء تک کی نظمیں خاص کر قابلِ ذکر ہیں ۔ جن میں زیادہ تر وطنیت کے آثار ملتے ہیں ۔ غرض کہ ہندوستان اقبال کی والہانہ تانوں سے گونج اٹھا ۔

بانگِ درا کے پہلے اور دوسرے دور میں اقبال ابھی سراپا تجسس تھے ۔ اقبال کی ذہنی کیفیت بے چینی اور تلاش کا پتہ دیتی تھی ، اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ شاعر ابھی خودی کے اسرار سے واقف نہیں ہوا تھا جس کا ذکر آپ کی بعد کی شاعری میں نظر آتا ہے ۔ اس وقت آپ کی یہ تلاشِ گلِ رنگین شمع و پروانہ ، آفتاب ، بچہ اور شمع ، ماہِ نو ، جگنو ، کنارہ راوی ، موج دریا کی صورت میں دیکھی گئی ۔

اس ابتدائی دور ہی میں اقبال کے من میں تڑپ ناصبوری حسن و عشق ذوقِ آگہی کی موجیں موجزن تھیں ۔ اسی لگن اور جستجو کے تحت اقبال ایک اعلیٰ نصب العین کی خاطر یورپ کو سدھارے ۔ اس نصب العین کا اندازہ آپ اس نظم سے کر سکتے ہیں ، جو آپ نے یورپ جاتے وقت حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے آستانے پر حاضری دیتے ہوئے کہی

چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
نظر ہے ابر کرم پر درخت صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاج باغباں مجھ کو
فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا ہے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنھوں نے محبت کا راز داں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے
یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

پہلے دور کی شاعری اس نظم پر ختم ہوتی ہے اور یہ دور اقبال کی یورپ کے لیے حصولِ تعلیم کے لیے روانگی پر ختم ہوتا ہے۔

دوسرے دور میں اقبال کی جگر سوزی اور بھی عمیق ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک پیمبرانہ روپ اختیار کر گئی۔ آپ نے یورپ کے تین سالہ قیام میں یورپ کا جو رنگ ڈھنگ دیکھا اُس سے آپ کو بہت مایوسی ہوئی۔ یورپ والے مادیت میں اُلجھے ہوئے تھے۔ انسانی ہمدردی سے بیزار اور روحانی قدروں سے بےبہرہ تھے۔ نظامِ سرمایہ داری بڑی بے دردی سے غریبوں کا خون چوس رہا تھا۔ قومیں قوموں کے خلاف تھیں۔ جماعتیں جماعتوں کے خلاف تھیں اور ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف نبرد آزما تھا۔ جنگِ عظیم کے ہولناک سائے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ یہ حالات دیکھ کر اقبال نے کہا:

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا

پھر وہ وقت بھی آیا کہ صرف قوم کو ہی اُن کے شعروں کی ضرورت نہ تھی بلکہ ملتِ اسلامیہ کو بھی ضرورت تھی، کیونکہ اُس وقت ملتِ اسلامیہ بھنور میں پھنسی ہوئی تھی۔ برِصغیر کی حالت بہت خراب

ہو رہی تھی - مسلمانانِ ہند پر تہذیب فرنگ غلبہ پا رہی تھی - چنانچہ علامہ نے مغربی تہذیب کے خلاف محاذ قائم کر لیا - جس میں انھوں نے مغربی تہذیب کے عیب چن چن کر گنوائے - بعد کے دور کا تمام کلام یورپ کے خلاف احتجاج اور نسلی قومیت اور فرنگی جمہوریت سے بیزاری کا منظر پیش کرتا ہے - یہی ان کی زندگی اور شاعری کا واحد موضوع بنا - جس کے اندر آپ نے خودی ، مردِ قلندر ، حسن و عشق کے سربستہ رازوں کو منکشف کیا اور یوں مسلمانوں کے دلوں میں ایک نئی روح پھونک دی -

آپ کے نزدیک شاعری کا یہ مقصد نہ تھا کہ لوگوں کو اپنی شاعری سے خود فراموشی اور بے بندگی میں مبتلا کریں - بلکہ آپ نے اگر تعقل پرستی کی مخالفت بھی کی تو صرف اس لیے کہ تعقل پرستی کے ہزاروں پہلو فکر و دانش کو چونکاتے ہیں مگر اضطراب روح کے لیے اس کے پاس کوئی تسکین دہ پیغام نہ تھا - تعقل پرستی خاص کر یورپ کی تعقل پرستی نے بہت کوشش کی کہ سادہ مسلمان اسلامی تعلیمات کو چھوڑ کر پرپیچ راہوں میں کھو جائیں مگر ایسا نہ ہو سکا - ایسے برے وقت میں اقبال نے مسلمانوں کو سہارا دیا :

ترے سینے میں دم ہے دل نہیں ہے
ترا دم گرمیٔ محفل نہیں ہے
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

اس طرح بات کچھ یوں سمجھ میں آتی ہے کہ اقبال نے فلسفہ اور مذہب کو دو متضاد چیزیں قرار نہیں دیا - آپ نے صرف اُس تعقل پرستی اور فلسفیانہ رنگ پر تنقید کی ہے جو فرنگی تہذیب سے لیا گیا تھا :

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

اقبال یہ چاہتے تھے کہ اگر مسلمان مغربی فلسفہ میں اُلجھ کر رہ گئے تو دامنِ دین اُن کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا - جس سے ملتِ اسلامیہ

پارہ پارہ ہو جائے گی:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسول ہاشمی

"وارداتِ باطن کی کوئی بھی شکل ہو ہمیں بہرحال حق یہ پہنچتا ہے کہ عقل اور فکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی کے ساتھ تنقید کریں۔"

آپ نے تفکرِ اسلامی پر زور دیا اور فرمایا کہ

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرانیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد اور بنی نوع کا خادم کہلوائے گا۔"

اقبال کے نظریۂ خودی کو لیجیے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ خودی ہے کیا؟ اس کا تصور کیا ہے اور اس کی تکمیل کس مرحلے پر ہوتی ہے؟ پھر یہ کہ خودی کو بیان کرنے کے لیے کیا شاعرانہ مزاج ضروری ہے؟

خودی ذوقِ نمود کا ایک جذبہ ہے جو کائنات کی ہر جاندار شے میں موجود ہے۔ گلاب کا پھول شبنم کے قطرے سے پوچھتا ہے کہ تو کون ہے؟ میں کون ہوں؟ میری شاخ پر کون نغمہ سرا ہے؟ مقصود نوا کون ہے؟ مطلوب صبا کیا ہے؟

خودی نام ہے اپنے آپ کو پہچاننے کا۔ اپنی عظمت کو جاننے کا۔ جب ہم کہتے ہیں کہ حیات خودی سے عبارت ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ شعورِ ذات کا وہ احساس جسے "انا" یا "میں" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جس نے ہر کس خود اور "غیر خود" کی تفریق پیدا کرتے ہوئے اپنی الگ اور جداگانہ ہستی قائم کر رکھی ہے، فریب و واہمہ نہیں اس کا اصل وجود محض خودی ہے۔ باقی سب اس کے مظہر ہیں۔ یہ کائنات اس کی مظہر، یہ آسمان اس کا مظہر ہے۔ حیات کی اصل خودی سے ہی ہے۔

"من" کی تخلیق بھی خودی کی طرف لے جاتی ہے۔ ان میں یہ خودی کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ ان کی زندگی سراپا جدوجہد ہو جاتی ہے۔ باالفاظ دیگر اس کا ایک میدان بن جاتا ہے۔ جس کے اندر ساری کائنات اور خدا کی ذات بھی آ جاتی ہے۔

یا پھر یوں کہہ لیجیے "خودی نام ہے خود آگہی سے خدا آگہی تک کا" اس کے بعد اس کے تین مرحلے آتے ہیں۔ نور، حیا اور عشق۔

ان کی تشریح یوں کی جا سکتی ہے کہ نور انسان کے اندر موجزن ہوتا ہے، جس سے اس کے دل کا ہر گوشہ منور ہوتا ہے، مگر وہ اس کو آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ حیا وہ خوف ہے جو صرف خدا سے ہے۔ اس سے تمام دنیاوی خوف مٹ جاتے ہیں۔ وہ دنیاوی حادثوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ خودی کی تخلیق سے اس کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اس کے بعد آخری اور سب سے لازوال خودی کی منزل آتی ہے جسے عشق کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اسے ہم قرآنی رو سے ایمان بھی کہتے ہیں۔ عشق خطرات سے بے خبر اپنی خودی کی تکمیل کرتا رہتا ہے۔ حقیقت میں عشق جہاد کا نام ہے جو شر کی طاقتوں کے خلاف ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ خودی اس وقت مکمل ہوتی ہے جب انسان کو خدا کے وجود پر یقین ہو جاتا ہے۔ یہ یقین ہی اسے واپس پھر اسی سے ملا دیتا ہے جس کا وہ حصہ ہے۔ وہ لا الہ الا اللہ پر حقیقی ایمان لے آتا ہے یہی ایمان اس کی خودی کو تیز کرتا ہے:

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ

خودی کو قائم رکھنے کے لیے بے شمار پہلوؤں پر نظر رکھنی پڑتی ہے جن میں اطاعت ضبط نفس اور نیابت الٰہی ہیں۔ جب انسان کسی نظام کی مکمل اطاعت قبول کر لیتا ہے۔ اس کے لیے ہر قربانی کو تیار ہو جاتا ہے اور نیابتِ الٰہی کا حق دار بن جاتا ہے۔ جب خودی کی نشو و نما اس حد تک آ جائے کہ ہر تقدیر اس کے اپنے ہاتھوں میں ہو

تو یہ خودی کی انتہا ہے :

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

تو اس وقت انسان مردِ مومن کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو اقبال کا پیرو ہے ۔ جس قوم کے افراد نے خودی کو نہ جانا وہ ذلیل و خوار ہوئے :

ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

اب سوال یہ ہے کہ کیا اقبال نے غزل میں نظم گوئی کی ؟ سچی بات تو یہ ہے کہ اقبال بنیادی طور پر غزل کا شاعر نہ تھا ۔ بات کچھ یوں سمجھ میں آتی ہے کہ جس فلسفہ کا ذکر اقبال نے اپنے شعروں میں کیا وہ بہت مشکل اور دقیق ہے ۔ مگر اقبال کے شاعرانہ مزاج نے اس فلسفہ کو غزل میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ۔ غزل جس انتشارِ فکر کی حامل ہے ، وہ بات نظم کے اندر بالکل نہیں پائی جاتی ۔ اقبال نے یہی کمال کیا کہ غزل گوئی میں نظم گوئی کی ۔ جس سے ایک بالکل الگ اور جدا گانہ حیثیت اقبال نے مستحکم کر لی ۔ یہ بات قابلِ تعریف اور موجبِ حیرت بھی ہے ۔ اس لیے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بالِ جبریل کی تمام غزلیں مسلسل غزلیں ہیں ، اور لطف کی بات یہ ہے کہ انہیں پڑھ کر کوئی الجھاؤ محسوس نہیں ہوتا جیسا کہ پہلے شعراء کی مسلسل غزل میں پایا جاتا تھا ۔ جہاں تک اقبال کے غزل کے لب و لہجہ اور صوتی آہنگ کا تعلق ہے تو وہ بھی نظم کے مزاج کا عکس ہے ۔ اقبال نے عربی فلسفہ اور فارسی کے ساتھ قرآنِ کریم کا جو گہرا مطالعہ کیا ، اس کا رنگ اقبال کی شاعری میں بہت زیادہ پایا جاتا ہے ۔ مسلم شخصیت کے حوالوں اور تلمیحات سے آپ کے کلام میں اور بھی خوبصورتی اور نکھار پیدا ہو گیا ۔ یہی بات اقبال کو دیگر شعراء سے ممتاز بھی کرتی ہے ۔ اگر ہمیں اقبال کے بیان اور خوش نما تراکیب کا موازنہ کسی دوسرے شاعر سے کرنا ہو تو ماسوا مرزا غالب کے کوئی نظر نہیں آتا ، جس نے اس لب و لہجہ میں غزل گوئی کی ۔

اگر ہم اقبال کی غزل کا مطالعہ کرنا چاہیں تو ہمیں دیگر شعرا حضرات کے تناظر سے جدا کر کے دیکھنا ہو گا ، اور صرف اسی صورت میں ہمیں اقبال کی غزل جس میں نظم کا رنگ چھایا ہوا ہے ، سود مند ثابت ہو گی - آپ اس غزل سے اقبال اور اُس کے پیش رووٴں میں فرق محسوس کر سکتے ہیں :

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا ؟
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا ؟
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لا مکاں خالی
خطا کس کی ہے یا رب لا مکاں تیرا ہے یا میرا ؟
اُسے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیوں کر
مجھے معلوم کیا ! وہ راز داں تیرا ہے یا میرا ؟
محمدؐ بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا ؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا ؟

اقبال پر بعض زبان کے رسیا حضرات نے یہ بھی اعتراض کیا ہے کہ اقبال کی غزل میں تغزل کی کمی ہے اُس میں نظم گوئی وغیرہ پائی جاتی ہے اس مسئلہ کو سید وقار عظیم مرحوم نے اس طرح سلجھایا :

”اقبال کی غزل میں کلاسیکی غزل کا تغزل نہیں بلکہ یہ اُس کا اپنا پیدا کردہ ہے - اس سے اُس کی غزل کی شان اور بھی بڑھ جاتی ہے - جس کو بعض حضرات غزل میں تغزل کا فقدان یا غزل میں نظم گوئی سے موسوم کرتے ہیں -“

اس سوال کا جواب تفصیل کا محتاج ہے کہ اقبال نے حکمائے فرنگ کے افکار و نظریات سے کوئی اثر قبول کیا یا نہیں ؟ کیا اُنھوں نے جدید فلسفہ کی پیروی کی جو حکمائے فرنگ نے پیش کیا ، یا اسلامی فلسفہ پر کاربند ہوئے ؟

یہاں پر صرف فلسفہ کے بارے میں اقبال کا ردِ عمل بتلا دینا ضروری ہے - آپ کے نزدیک فلسفہ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں - آپ اس کی

آزادانہ نشو و نما کو تسلیم کرتے ہیں اور اس پر کوئی پابندی یا روک عائد نہیں کرتے ۔ مگر آپ فلسفہ کو ایک حد تک کارآمد خیال کرتے ہیں اس کے بعد اسے ناکارہ سمجھتے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کو فلسفہ کی عالمگیر حکمرانی سے کلی انکار ہے ۔ آپ فلسفہ کو حقیقت کی تلاش کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں ۔ ایک مسافر راستہ طے کر رہا ہے ۔ راستے میں کبھی رکتا ہے ، کبھی آہستہ آہستہ چل پڑتا ہے ۔ اس طرح رک رک کر چلنا کیا اسے منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا ۔ یہ حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی منزل کو جا لے گا ۔ فلسفہ چراغِ راہ ہے ، خود راہ نہیں ہے ۔ تاہم آپ مغربی فلسفہ کو پسند نہیں فرماتے کیونکہ مغربی فلسفہ راستہ دکھاتا نہیں راستہ سے گمراہ کرتا ہے :

دانش حاضر حجاب اکبر است
بت پرست و بت فروش و بت گر است

بعض حضرات اس غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ اقبال کے افکار و نظریات مغربی حکما سے ماخوذ ہیں ، اور ان کے ذہنی ارتقا کی بنیاد مغرب کے جدید افکار و نظریات نے استوار کی ہے ۔

یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے ۔ جس طرح ہر نظام فلسفہ کا ایک مرکز اور ایک دائرہ کار ہوتا ہے ۔ بعینہ اقبال کے فلسفہ کا ایک مرکز ہے ، یعنی تصور خودی اور اس تصور کی ہلکی سی رمق بھی حکمائے فرنگ میں نہیں ۔ تصور خودی خالصتاً اسلامی فلسفہ ہے ۔ یہ خیال نٹشے اور برگساں یا پھر کسی دوسرے مفکر سے نہیں لیا گیا ۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے مولانا رومی کے خیالات کو اپنایا جس کے نظریات کی بنیاد اسلام کی تعلیمات ہیں ۔ اسی لیے آپ مسلمانوں کو اس کی بیماریوں کا علاج آتش رومی کے سوز میں بتلاتے ہیں ، اور آپ مغربی حکمت کا نقشہ اس انداز میں کھینچتے ہیں :

حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

اقبال ایک جگہ کہتے ہیں کہ میری تحریروں پر اثر اور اس کی پرورش حکماء اور صوفیائے اسلام نے کی ۔ نہ کہ اقبال نے یورپ کے علمی سرچشموں

سے فیض حاصل کیا ۔ ہاں ! اگر اقبال نے فیض حاصل کیا تو وہ قرآنِ کریم تھا ، وہ اقبال کا عشقِ رسالت تھا ، وہ صوفیا کا فلسفۂ غم تھا ، جس سے اقبال نے اپنی بصیرت کو منور کیا ۔ اقبال کے فلسفہ میں اس کا اپنا خالص اسلامی ذہن نظر آتا ہے ۔ جس نے مردِ مومن یا مردِ کامل کی تشکیل کی اور جس نے تصورِ خودی کو جنم دیا ۔

ان تمام نظریات کے سوتے اسلام سے پھوٹتے ہیں ۔ اسلام کے بعد دوسرا منبع مولانا روم ہیں جن کو اقبال پیرِ روم کہتے ہیں اور فرماتے ہیں :

صحبت پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ، ایک کلیم سر بکف
مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لا تخف

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی شاعری کا عہد بہ عہد مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ابتدا سے لے کر ۱۹۳۸ء تک (جب آپ جاں بحق ہوئے) اسلام اور مولانا روم سے متاثر تھے اور آپ نے مغربی فلسفہ کا مطالعہ تو کیا لیکن اسے اپنے فلسفہ کی بنیاد نہ ٹھہرایا اور یہی اقبال کی عظمت ہے ۔

☆ ☆ ☆

افتخار الحسن زاہد

اقبال کا تصورِ معیشت

ڈاکٹر فرنیول (Furnivell) نے براؤننگ کی شاعری پر لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا کہ

"وہ ہمارے شعراء میں سب سے زیادہ توانا ، سب سے زیادہ جواں ہمت ، عمیق النظر ، صاحبِ فکر اور بلند پرواز ہے ، وہ محض آب و گل کا خاموش پیکر ہی نہیں بلکہ زندگی کا ایک بے تاب مظہر ہے ۔"

میں بھی موصوف کی طرح براؤننگ کا مداح ہوں ۔ اس کی جسارت ، بے باکی ، حوصلہ مندی ، شوخی ، آہنی عزم ، ناقابلِ شکست یقین اور بے پناہ توانائی کا قائل ہوں ۔ لیکن مجھے اقبال سے زیادہ عقیدت ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ جو الفاظ ڈاکٹر فرنیول نے براؤننگ کے متعلق استعمال فرمائے تھے وہ کہیں زیادہ برجستگی سے ترجمانِ حقیقت اقبال پر صادق آتے ہیں ۔ دونوں کی شاعری اور خاص کر اقبال کی شاعری برائے معیشت ایک حیات افروز پیغام کی حامل ہے ۔ البتہ ایک کا روئے سخن ایک متزلزل قوم کی طرف ہے جو یاس کی بھیانک ظلمتوں سے دوچار ہے اور دوسرے کا روئے سخن مادیت میں ڈوبی ہوئی قوم کی طرف ہے جو صدہا شکوک و اوہام سے دست و گریباں ہے ۔

اقبال کا تصورِ معیشت وہی ہے جو اسلام نے اختیار کیا اور جو قید معیشت کو آزاد معیشت میں تبدیل کر دیتا ہے اور اس آزادی کو اسی طرح چند حدود کا پابند بناتا ہے جس طرح تمدن و معاشرت کے تمام دوسرے شعبوں میں انسانی آزادی کو محدود کیا گیا ہے ۔ اس کے ساتھ وہ

ایسے تمام دروازے بند کر دیتا ہے جن سے آزاد معیشت میں فاسد و مفسد نظام سرمایہ داری کی خصوصیات اور اثرات و نتائج پیدا ہونے کا امکان ہو ۔

مملکت خداداد پاکستان کا قیام بیسویں صدی کا ایک معجزہ ہے ۔ جس کے قیام کا خواب اسی مفکر اعظم نے صرف چند سال پیشتر دیکھا تھا اور جس کی تعبیر کو اپنی چشم ظاہر سے دیکھے بغیر وہ اپنے خالق سے جا ملا :

مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

تبت اور ہمالیہ کے وسیع و عریض اقطاع پر اشتراکی چین کا نفوذ ابھی کل کی بات ہے لیکن حضرت علامہ نے اس سے کہیں پہلے پیش گوئی کی تھی کہ

گیا دور سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے — ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

اس ثبوت کی پیش کش سے میں ہرگز آپ کو یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے نہیں کہتا کہ حکیم الامت کو آنے والے واقعات کا یقینی علم تھا ، بلکہ میرا ادعا محض اتنا ہے کہ اس حصہ عالم میں جو واقعات آنے والے تھے وہ اپنا سایہ اقبال کے ضمیر روشن پر برابر ڈال رہے تھے جن سے نیابت الٰہی کا کردار عظیم ادا کرنے والی ایک منتخب قوم کا متصف ہونا اس کی نظر میں ضروری تھا ، چنانچہ نغمات شاعر نے اپنے دور وسطیٰ میں تعلیمات حکیمہ کا رنگ اختیار کر لیا اور فکر اقبال میں خودی ، ایمان اور فقر کے عناصر سہ گانہ اس ملہمانہ انداز سے ابھرے کہ چشم عالم کھلی کی کھلی رہ گئی ۔

اقبال کو یقین تھا کہ جب اس کا مثالی نوجوان ان صفات عالیہ سے متصف ہو کر عرصۂ عالم میں اترے گا تو نہ صرف وہ اس بادشاہت کا اہل ثابت ہو گا بلکہ اپنے بے مثال اسلحہ کی مدد سے وہ اس کا اور اس کے ساتھ خود انسانیت عظمیٰ کا تحفظ بھی کر سکے گا ۔ ضمیر اقبال پر یہ

حقیقت بھی روشن تھی کہ اس دور تقابل میں کسی چھوٹی قوم کے لیے یہ ہرگز ممکن نہیں کہ وہ اپنے روحانی اور تمدنی تقاضوں کے مطابق اطمینان سے آبرو مندانہ زندگی بسر کر سکے ۔ ان کو یقین تھا کہ جب تک وہ قوت اور کردار و سیرت کے اعتبار سے ایک نہایت باجبروت قوم نہیں بنے گی اس کے لیے اس زمین پر خدا کی بادشاہت قائم کرنا تو کجا عزت کے دو سانس لینا بھی ممکن نہیں ہو گا ۔ چنانچہ انھوں نے اسے مال و دولت جمع کرنے اور ساز و سامان سے آراستہ ہونے کا طریقہ نہیں بنایا ، بلکہ نیابتِ الٰہی کا وہ اصول سمجھایا جو فوز عظیم کی منزل کو قریب تر لاتا اور انسان کو فوق البشر کی اعلیٰ قوتوں سے بہرہ ور کرتا ہے فرمایا کہ

یہ نکتہ سرگزشت ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوام زمین ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

پھر فرمایا کہ :

تو اپنی سرنوشت خود اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تیری جبیں
یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمت ہو پر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں

اور جب خودی ، ایمان اور فقر کے یہ عناصر سہ گانہ ایک نسخۂ کامل میں ترتیب پا چکے تو حکیم الامت کے منشاء کے عین مطابق اس میں سے ایک بے داغ تندرست اور توانا معیشت کا تصور ابھرا جو ایک قوم تازہ اور اس کے افراد تازہ تر کے لیے نہ صرف ایک مثالی حیثیت رکھتا تھا بلکہ اس امر کا بھی ضامن تھا کہ بالآخر وہی ان کے لیے دوام رہبریٔ اقوام کے حصول کا موجب بھی ثابت ہوگا ۔

انھوں نے کسی موجود موقع و محل یا کسی ظاہری محرک کے بعد اپنی قوم کے نوجوان کو بار بار یہ تاکید کی کہ وہ مال عزیز پر ہرگز نگاہ نہ رکھے اور اس زہر کو کبھی اپنی روزی کا ذریعہ نہ بنائے ۔ کلام اقبال

میں شاہین کے مقابل کرگس کی پیش کش تاکید و تنبیہہ کی ایک ادنیٰ تشکیل ہے:

پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکار زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

شاہین کو تنومندی، بلند پروازی اور بے نیازی کا مجسمہ بنا کر اپنی قوم کے جوانانِ فرد کے سامنے پیش کرنے سے اقبال کا مقصد یہ نہیں تھا کہ انہیں دنیا اور اس کے متعلقات سے متنفر و بے زار کر دے بلکہ اس کے خلاف اقبال کا مقصد یہ تھا کہ نوجوانانِ عالم اپنی سیرت میں صلابت اور نظر میں دور بینی پیدا کریں اور دوسروں کی فتوحات و املاک سے ایک درویشانہ بے نیازی کی عادت ڈالیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہی قوم دنیا میں پائیدار سطوت اور محکم سربلندی حاصل کر سکتی ہے جو اسباب دنیا تو حاصل کرے لیکن انہیں ہمیشہ اپنے قدموں تلے رکھے اپنا معبود نہ بنائے۔ شاہین کا تصور اسی تقاضے کی تخلیق تھا اور وہ بار بار اپنی قوم کو کرگسیت سے متنفر کرنے کی سعی بلیغ کرتا ہے:

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج!
بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملا کی اذاں اور ہے مجاہد کی اذاں اور

حکیم الامت کی نگاہیں قبائلی علاقوں کے رہنے والوں کی طرف بار بار اٹھیں اور تاریخ کے دھندلکوں کو چیرتی ہوئی سکندرِ اعظم کے زمانے تک چلی گئیں اور جب واپس آئیں تو وہ اس کیف رومانی سے گراں بار تھیں جو کوہستان کے ان فرزندوں کی آزادی و خوشحالی کی جنگ باہم میں آزادی کی کامرانی حاصل ہوئی تھی اسے کیا خبر تھی کہ وہ وقت بھی عنقریب آنے والا ہے جب اس کے وطن عزیز میں آزادی و خوشحالی کی جنگ ایک اور صورت میں بپا ہو گی تو وہ توپ و تفنگ کا کام لے کر اس سرزمینِ پاک کو پھر اپنے زیرِ نگیں لانے کی سعی بلیغ کریں گے اور کیا

عجب کہ کامیاب ہو جائیں ۔ حکیم الامت نے یہ معرکہ روح و بدن ایک اور رنگ میں دیکھا تھا اور اپنی ملت کے نوجوان کو اس کے نتائج سے محراب گل کی زبان میں یوں خبردار کیا تھا :

میرے کہستاں ! تجھے چھوڑ کر جاؤں کہاں
تیری چٹانوں میں ہے میرے اب و جد کی خاک
اے میرے خفیہ غیور فیصلہ تیرا ہے کیا
خلعت انگریز یا پیرہن چاک چاک

اور اس سوال کا یہ خود ہی جواب دے دیا تھا کہ :

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

اور فقر غیور کے اسی فیصلے کو ایک اور اسلوب میں یوں بیان فرمایا کہ :

من کی دنیا ؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا ؟ تن کی دنیا سود و سودا فکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

اور پھر محراب گل کے بعد ایک جگہ فرمایا ہے :

جس سمت میں چاہے صفت سیل رواں چل
وادی یہ ہماری ہے ، وہ صحرا بھی ہمارا
تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

اور وہ اشارہ یہی تھا کہ جب روح و بدن کے معرکہ میں انتخاب کا وقت آئے تو روح کو بدن پر اس لیے ترجیح دو کہ بدنوں کی دنیا میں تمہارا

بدن کوئی حیثیت نہیں رکھتا ۔ اپنے آپ کو پہچانو ، اپنی عظمت خوابیدہ کا جائزہ اور اپنے نفس مطمئنہ کی قوت بے نہایت سے اسی فوز کبیر تک پہنچ جاؤ ۔ دولت تمھارے قدموں کی خاک بن کر رہے تمھاری آنکھوں کا سرمہ نہ بن سکے ۔

کسی قوم کی معیشت میں وسائل دولت کی تقسیم نہ صرف ایک نہایت اہم مقام رکھتی ہے بلکہ ایسے مسائل بھی پیش کرتی ہے جو اس کی داخلی زندگی اور اقوامِ عالم میں اس کے مقام دونوں پر بدرجۂ نہایت اثر انداز ہو ۔

ناممکن تھا کہ اس عالمگیر مسئلے کی لہریں شاعرِ مشرق کے افق خیال پر وارد نہ ہوتیں ۔ چنانچہ ہمیں وہ روح لینن کی زبان میں خالقِ کائنات سے برملا یہ سوال کر دیتا ہے کہ :

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدم خاکی ، کہ جو ہے زیر سماوات ؟

اور کبھی خداوند ارض و سما کی زبان سے فرشتوں کو یہ حکم دلوایا کہ :

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امراء کے در و دیوار ہلا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اس میں کوئی شک نہیں کہ اشتراکیت نے سرمایہ داری کے زہر کا ایک ضروری اور وقتی طور پر تریاق ضرور پیش کیا لیکن اقبال کی نگاہ حکیمانہ نے اس نکتے کو محصور کر لیا تھا ۔

اقبال کا مثالی فرد پیکر ایثار ہونے کے ساتھ ساتھ انتہا درجے کا سخت کوش بھی ہے کہ اس کی سخت کوشی ہی اسے اس درجے تک پہنچاتی

ہے جہاں وہ ایسے نتائجِ اکتساب کو انسانیت کی نذر کر دیتا ہے اس لیے بنیادی وسائل دولت کو اقبال نے محض اللہ کی ملک قرار دیا ہے۔ انسان کو اس پر کوئی موروثی یا مستقل حق نہیں دیا بلکہ اسے تقسیم در تقسیم کے ذریعے پھر معاشرے کو واپس کر دیا ہے اور یہی عین حکمت اسلام ہے:

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

اقبال نے معیشت کا ایک نکھرا ہوا تصور ہمارے سامنے رکھا لیکن مقام حیرت و افسوس ہے کہ جس طرف دیکھو، دار و گیر اور حرص و ہوا کا بازار گرم ہے۔ آج آپ کو اپنے گرد جتنے چہرے نظر آتے ہیں ان میں سے بیشتر کی پیشانیوں پر "ھل من مزید" کا عنوان خط بے نشاں میں لکھا ہوا نظر آئے گا۔ آج اقبال کے تصور کی مملکت میں قریب قریب ہر شخص ایک ہی دھن میں گم اور ایک ہی لگن میں مگن ملے گا، اور وہ دھن اور لگن حصولِ زر اور تلاش دولت کے سوا اور قطعاً کچھ نہیں ہو گی:

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

وہ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ دولت ایک بہتا ہوا پانی ہے اسے حوض میں بھر کر روک لیں تو تعفن پیدا کر کے معاشرے کو بیمار کر دے گا اور وہ چیز جسے عرف عام میں برکت کہتے ہیں اس میں بخار بن کر اڑ جائے گا۔

صفحۂ ایام سے داغ مداد شب مٹا!
آسماں سے نقش باطل کی طرح کوکب مٹا!

آج ہمیں ایسے نفوس قدسی کی ضرورت ہے جو زندگی میں داد و دہش کے عناصر عملی طور پر نمایاں کر کے موت کی طرف لے جانے والے راستے سے ہٹا کر منزل خیر دوام کے راستے پر ڈالیں۔ یاد رکھیے خیر سے پیدا ہونے والی قوت وہ قوتِ عظیم ہے جو کسی قوم کے جسم میں خون بن کر

دوڑنے لگے تو حقیقی عظمت اس کے قدم چومتی ہے اور تقدیر ربانی آگے آگے چلتی ہے۔

دنیا کی فائز المرام قوموں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں لیکن خود ہماری اپنی روایات ابھی یکسر فنا نہیں ہوئیں لیکن کون ہے جو آنکھیں کھولے اور زمانے کے بڑھتے ہوئے سائے کو آنکھیں کھول کر دیکھے اور مستقبل کے قدموں کی چاپ سن کر خبردار ہو جائے؟

قلب میں سوز نہیں ، روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمد کا تمھیں پاس نہیں

———

جو تھا نہیں ہے ، جو ہے نہ ہو گا ، یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

———

فریب خوردۂ منزل ہے کارواں ورنہ
زیادہ راحت منزل سے ہے نشاط رحیل
مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت ، کہاں حجاب دلیل
اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل
غریب و سادہ و رنگیں ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ، ابتدا ہے اسمٰعیل

٭ ٭ ٭

مس خالدہ ناہید

اقبال کا تصورِ فن

اقبال آرٹ کو حصولِ مقاصد کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک آرٹ وہ ہے جو انسانی زندگی کو بہتر اور حسین بناتا ہے اور جو فن ایسا کرنے میں ناکام رہتا ہے وہ کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ ہر عظیم شاعر کا آرٹ کے متعلق کوئی نہ کوئی نقطۂ نظر ہوتا ہے ۔ اقبال کے نزدیک آرٹ زندگی کا خادم ہے ان کے خیال میں فن کار کو اپنے دل و دماغ پر ایسی کیفیت طاری کرنی چاہیے جس کا محرک جوشِ عشق ہو اور اس کیفیت کی شدت کا یہ عالم ہو کہ شاعر اس کے اظہار پر مجبور ہو جائے یہی کیفیت آرٹ کی جان ہے :

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

مرقع چغتائی میں اقبال اپنے تصورِ فن کی یوں وضاحت کرتے ہیں :

"کسی قوم کی روحانی صحت کا دار و مدار اس کے شعراء اور فن کاروں کی الہامی صلاحیت پر ہوتا ہے لیکن یہ ایسی چیز نہیں جس پر کسی کو قابو حاصل ہو ۔ یہ ایک عطیہ ہے جس کی خاصیت اور تاثیر کے متعلق اس کا پانے والا اس وقت تک تنقیدی نظر نہیں ڈال سکتا جب تک کہ وہ اسے حاصل نہ کر چکا ہو ۔ اس لیے اس عطیے سے فیض یاب ہونے والے کی شخصیت اور خود اس عطیے کی حیات بخش تاثیر انسانیت کے لیے اہمیت رکھتے ہیں ۔ کسی زوال پذیر آرٹسٹ کی تخلیقی تحریک ، اگر اس میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنے نغمے یا تصویر سے لوگوں کے دل لبھا سکے ، قوم کے لیے اٹیلا اور چنگیز خاں کے لشکروں سے زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے ۔"

اقبال کے نزدیک شعر کسی فن کار کے جذبات کی ترجمانی کا ذریعہ ہے۔ شعر آرٹ کے صحیح تصور کی عکاسی کرتا ہے۔ آرٹ کا مقصد فطرت کی نقالی نہیں ان کے نزدیک آرٹ میں شخصی اور ذاتی عنصر کا ہونا لازمی ہے۔ اقبال فن کو خودی کے استحکام کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جو آرٹ خودی کی کمزوری کا سبب بنتا ہے، ان کے خیال میں وہ صحیح آرٹ نہیں فن خودی کو مستحکم کرنے کا ذریعہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

قوت اور توانائی کو اقبال کے آرٹ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہی جوشِ حیات ہے جو اقبال کی شعری قوت کو متحرک کرتا ہے۔ ہر طاقت ور چیز انہیں حسین نظر آتی ہے وہ آرٹ میں ایسی قوت و توانائی کے خواہاں ہیں جو مردوں میں زندگی کی روح پھونک دے جو بھٹکے ہوئے انسانوں کو راہ راست پر لے آئے جو غافلوں کو ہوش و ہواس بخش دے جس سے سوئی ہوئی انسانی قوتیں صحیح راستے پر گامزن ہوں جو روح کی بیداری کا پیغام دے۔ وہ آرٹ ایسا آرٹ نہ ہو جو صرف تاثراتی کیفیت پیدا کرتا ہے وہ کیفیت تو محض وقتی ہوتی ہے اور دیر پا ثابت نہیں ہو سکتی۔ جو فن زندگی کی تکمیل اور فراوانی میں مدد نہیں کرتا، مختلف انسانی مسائل کو حل کرنے میں مدد نہیں دیتا، وہ آرٹ بے معنی ہے۔ اقبال اس فن کو صحیح فن تصور کرتے ہیں جو زندگی پر پوری طرح چھا جائے اور ساتھ ہی ساتھ انسانی دل و دماغ کی رہبری بھی کرے۔ علامہ مرحوم آرٹ کو آرٹ کی خاطر پسند نہیں کرتے وہ اسے زندگی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں آرٹ کا مقصد جوش و ولولہ پیدا کرنا ہے جس پر روحانی صحت کا دار و مدار ہے۔ اقبال کے نزدیک آرٹ کو بامقصد، زندگی کا خادم بن کر اسے عظمت و حسن عطا کرنا ہے ایک فن کار کی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ وہ نہ صرف آرٹ کے ذریعے مسرت و انبساط کی کیفیت پیدا کرے بلکہ ان جذبات و احساسات کو بیدار کرے جو ارفع و اعلیٰ ہیں۔ آرٹ زندگی کے حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے۔

اقبال کے خیال میں کسی آرٹ کی فنی خوبیاں اس وقت اجاگر ہوتی ہیں جب ان میں حقائق کے ساتھ تخیل کی آمیزش بھی ہو مگر تخیل کی پرواز کے لیے حدود کا تعین ضروری ہے اگر قوت متخیلہ حدود کا تعین نہ کرے تو فن کی پوری خوبیاں ظاہر نہیں ہو سکتیں کیونکہ تخیل کی پرواز میں فن کار یا شاعر اتنی بلندی پر پہنچ جاتا ہے کہ بجائے فن کی پوری خوبیاں اجاگر ہونے کے اس کا دھندلا سا نقش باقی رہ جاتا ہے جس سے فن کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اقبال ایسے فن کار ہیں جو تخیل کی رنگ آمیزی کے باوجود حقیقت سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرتے۔

اقبال کے نزدیک حسن و صداقت کا معیار ایک ہی ہے جیسا کہ انھوں نے اپنی نظم ''شیکسپیئر'' میں کہا ہے:

برگ گل آئینۂ عارض زیبائے بہار
شاہد مے کے لیے حجلۂ جام آئینہ
حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن
دل انساں کو ترا حسن کلام آئینہ

آرٹ ہر حسین چیز کا عکاس ہے۔ آرٹ حسن ہی کا دوسرا نام ہے۔ زندگی حسن سے عبارت ہے، حسن آرزوؤں اور امنگوں کی تخلیق کا کام کرتا ہے اس میں زندگی کی شان جھلکتی ہے۔ وہ فرہاد کو پہاڑ کاٹنے پر مجبور کرتا ہے اور حسینوں کو صحرا نوردی پر۔ آرٹ حسن کی اس طرح نقاب کشائی کرتا ہے کہ نگاہیں اس کی آب و تاب سے خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال کا آرٹ صرف حسن آفرینی ہی کا کام سرانجام نہیں دیتا بلکہ ان اقدار کی تخلیق بھی کرتا ہے جو زندگی کے لیے ضروری اور لازمی ہیں۔

اقبال آرٹ کو روحانی اور اخلاقی تربیت کا وسیلہ سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اچھا ادب تبلیغ و اشاعت کا ذریعہ بنتا ہے۔ اقبال نے آرٹ کے اس مقصد سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ کسی قوم کی تعلیمی حالت کو سدھارنے کے لیے اچھے اور مفید ادب کی ضرورت ہوتی ہے اور اس تعلیم کا انحصار اچھے آرٹ پر ہے۔ اگر آرٹ میں قومی ذہنیت کو بیدار کرنے والی خوبیاں ہوں گی تو فن کار کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ فن کار جو کچھ

دیکھتا ہے اس طرح دوسروں کو دکھاتا ہے، جو خود سنتا ہے دوسروں کو بھی سناتا ہے۔ وہ اپنی ہنرمندی کی بدولت اپنے مشاہدات کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا کر دوسروں کے رو برو پیش کرتا ہے۔

اقبال کے نزدیک آرٹ میں خلوص کا ہونا لازمی ہے۔ کسی شاعر یا فن کار میں اس صفت کا ہونا لازمی ہے۔ اس کا خلوص عقلی بھی ہو سکتا ہے اور جذباتی بھی۔ اقبال کے ہاں ہمیں اس کی جذباتی شکل نظر آتی ہے اور بعض جگہ ان کا جالیاتی امتزاج بھی بڑی متوازن صورت میں ملتا ہے پھر بھی جذبات کی کارفرمائی سب سے زیادہ ہے۔ غیر مخلص شاعر کی حیثیت ایک نقال سے زیادہ نہیں ہوتی صرف شاعری ہی نہیں بلکہ کوئی فن بھی خلوص کے بغیر مکمل فن نہیں کہلاتا۔ اس لیے ہر فن میں خلوص کا عنصر ہونا لازمی اور ضروری ہے اقبال نے جس چیز کو "خونِ جگر" کا نام دیا ہے وہی یہ خلوص ہے جو جذبے کے آغوش میں پروان چڑھا ہے۔ انھی خیالات کا اظہار اقبال نے اپنی نظم "مسجدِ قرطبہ" میں جا بجا کیا ہے کہ سوائے ہنر کی ان اقسام کے جن میں خلوص کارفرما ہے سب چیزیں آنی و فانی ہیں:

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود
قطرۂ خونِ جگر سل کو بناتا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اس کے بعد پھر ایک جگہ اس خیال کا اظہار دوسرے طریقے سے کرتے ہیں کہ نغمہ نے میں تاثیر خود بخود پیدا نہیں ہو جاتی بلکہ فن کار کے پوشیدہ خلوص کے بامعنی جذبات ہیں جو تحلیل ہو کر اپنا اثر دکھاتے ہیں اگر اس کے دل میں سوز و خلوص نہ ہو تو نغمہ مردہ و بے جان ہو کر رہ جائے:

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرور مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے

جس روز دل کے رمز مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

مغنّی کی نوا کی پرورش کے لیے خونِ جگر کی ضرورت اقبال محسوس کرتے ہیں ورنہ ایسی تو نے بے اثر رہے گی۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

حقیقی شاعر یا فن کار اپنے فن کو خلوص کے رنگ میں رنگ کر پیش کرتا ہے اس کے شعر کا ہر مصرعہ اس کے دل کا قطرۂ خوں ہوتا ہے :

برگ گل رنگین مضمون من است
مصرع من قطرۂ خون من است

اقبال اس آرٹ کو بے معنی خیال کرتے ہیں جس سے زندگی میں وسعت و بیکرانی پیدا نہیں ہوتی اگر اس میں اتنی وسعت و ہمہ گیری نہیں تو وہ زندگی کے اُلجھے ہوئے تار نہیں سلجھا سکتا اس سے مسرت و انبساط کی کیفیت پیدا ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

پھر ایک اور جگہ اسی خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے :

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی

شدت خلوص ایسی چیز ہے جس سے زندگی کے سربستہ راز منکشف ہوتے ہیں۔ ہر بڑا شاعر خلوص کی شدت سے یہ کام لیتا ہے۔ اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کرتا ہے وہ ان حقائق کی گرہ کشائی کرتا ہے جو عام انسانی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ جس کی تہہ تک ایک عام انسان کی نظر نہیں پہنچ سکتی، شاعر کا خلوص ان عمیق گہرائیوں تک پہنچنے میں اسے مدد دیتا ہے۔ جو فن کار اپنے فن کے ذریعے زندگی کے اظہار کی آرزو کرتا ہے اس کی تخلیق پُراثر اور حقیقی ہوتی ہے۔ اقبال شاعرِ حیات ہیں اور زندگی ان کا موضوع ہے زندگی کے نغمے ان کے کلام کی جان ہیں جو تصور وہ فن کے متعلق پیش کرتے ہیں اسی پر خود عمل پیرا ہوتے ہیں۔ ان کے مقاصد کی بلندی نے ان کے آرٹ کو بھی بلند کر دیا ہے۔

اقبال کے نزدیک آرٹ کا مقصد فطرت کی نقالی نہیں ۔ وہ آرٹ کو خودی کے استحکام کا ذریعہ سمجھتے ہیں ۔ ان کے آرٹ کا نظریہ ان کے فلسفہ خودی کے تابع ہے ۔ وہ آرٹ کو بھی اظہارِ خودی کا وسیلہ سمجھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک وہ آرٹ کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا جس میں خودی باقی نہ ہو ۔ جو آرٹ خودی کی کمزوری کا سبب بنتا ہے ان کے خیال میں وہ آرٹ صحیح آرٹ نہیں ۔

اقبال آرٹ میں اختصار اور رمزیت و ایمائیت کے قائل ہیں ان کے نزدیک آرٹ کی خوبصورتی رمزیہ انداز میں ہے بات کھول کر بیان کرنے سے آرٹ کا حسن جاتا رہتا ہے اس کی خوبی اس میں ہے کہ آرٹ اشارے دکھانے پر ہی اکتفا کرے یہی صفت ان کے اپنے کلام میں جا بجا پائی جاتی ہے ۔ اقبال چونکہ تن آسانی کے خواہاں نہیں ہیں اس لیے اشاروں میں بات کر کے ذہنِ انسانی کو گرہ کشائی کا موقع دیتے ہیں تاکہ اسے اصل مفہوم تک پہنچنے کے لیے کچھ نہ کچھ جد و جہد کرنی پڑے ۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے ذہن انسانی کی خفتہ قوتیں ہی بیدار نہیں ہوتیں بلکہ دل تک اس کی رسائی ہوتی ہے تاکہ دماغ کے ساتھ ساتھ اس کا اثر دل پر بھی ہو سکے ۔ یہ خلا ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ باوجود کوشش کے پر نہ ہو سکے ۔ اس قسم کی مہمل گوئی سے اقبال پرہیز کرتے ہیں کیونکہ ایسا اندازِ بیان ذہنِ انسانی کو حقیقی منزل کا پتہ نہیں دیتا اور وہ پرپیچ راستوں کی بھول بھلیوں میں الجھا رہتا ہے ۔ اقبال کے نزدیک ادب اور آرٹ کا گہرا رشتہ ہے جو فن زندگی سے تعلق نہیں رکھتا اور زندگی کے حقائق کا ترجمان نہیں بنتا وہ صحیح معنوں میں آرٹ نہیں کہلاتا ۔ اقبال نے روائتی رمز نگاری سے پورا استفادہ کیا ہے وہ ایمائیت اور رمزیت کو اس خوبی سے برتتے ہیں کہ شاید ہی کوئی دوسرا ان کی طرح اس طریقِ فن سے آشنا ہو ۔ استعارے اور کنائے کی مدد سے وہ اپنا مطلب پوری طرح ادا کر دیتے ہیں ۔ وہ فن کے اس طریق کار سے بخوبی واقف ہیں کہ شاعر کے مشاہدے میں رمز و کنائے کی بدولت وسعت و بیکرانی پیدا ہو جاتی ہے شعر کا مطلب لامتناہی ہوتا ہے اور الفاظ کی تفصیل اس کی متحمل نہیں ہو سکتی ، اس لیے اسرار و رموز کے ذریعے اس کا مطلب ادا ہوتا ہے اور یہی اچھے فن کی خصوصیت ہے جہاں شعور کی رسائی ممکن نہیں وہاں

رمزی طرزِ ادا کا پیدا ہونا لازمی امر ہے ۔ رمزیت کے بغیر شعر میں حسن نکھار پیدا نہیں ہوتا ۔ رمزی انداز بیان کا نمایاں وصف سامع کے دل میں ان یادوں کو تازہ کرنا ہے جن کے نقوش صفحہ دل پر ملبہم پڑ گئے ہوں ۔ اقبال کے کلام میں یہ خصوصیت نمایاں حیثیت رکھتی ہے ۔

اقبال آرٹ کی جو خصوصیات بیان کرتے ہیں ان میں سے ایک خاصیت آرٹ میں نفس گرم کی آمیزش بھی ہے اس کی موجودگی ان کے خیال میں آرٹ میں بہت ضروری ہے ۔ یہ نفس گرم جذبات و تخیل کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے یہ ایک ایسی قوت ہے جو اظہار کے لیے بے تاب رہتی ہے ۔ اقبال کو مشرق شعراء سے اس نفس گرم کی کمی کی شکایت ہے ۔ خلش آرزو جو حقیقی شاعری میں سوز و اثر پیدا کرتی ہے ۔ ان شعراء کے ہاں مفقود ہے ۔ اقبال اپنے آرٹ کی یہی امتیازی خصوصیت بتاتے ہیں کہ اس میں نفس گرم کی آمیزش ہے ۔ چنانچہ اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں :

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس نے
شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

اقبال قوت و آزادی کو پسند کرتے ہیں اس لیے ان کی شاعری کا رجحان رومانیت کی طرف ہے جو عقلیت کے فلسفے کے خلاف ردِ عمل تھا اقبال اس عقلی نظم و ضبط کو قوتِ حیات کے لیے کمزوری کا سبب سمجھتے ہیں ان کے ہاں ماضی کی قدر دانی نمایاں ہے ۔ خصوصاً اسلام کا ماضی آن کی شاعری میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ ماضی کی قدر دانی کے باوجود اقبال زندگی کے امکانات میں یقین رکھتے ہیں یہ دونوں رجحانات اقبال کے ہاں ہمیں دوش بدوش نظر آتے ہیں ۔ ان کا آرٹ ان دونوں رجحانات کا خوبصورت امتزاج ہے ۔ اقبال زندگی کے احساس کو شاعری کے ذریعے دوسروں کے لیے زیادہ شدید اور گہرا بنا دیتے ہیں ۔ اسے نئے معنی عطا کرتے ہیں تاکہ سمجھنے والے اسے پہلے کی نسبت زیادہ بہتر طریقے سے سمجھ سکیں ۔ ان کی شاعری زندگی کی اقدار کو واضح کرتی ہے وہ محض

خارجی عالم کا احوال بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ زندگی کی توجیہہ بھی کرتے ہیں ۔

زبور عجم میں اقبال نے غلاموں کے آرٹ کو موضوع بحث بنایا ہے ۔ غلام اقوام کے آرٹ کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے غلام اقوام کے آرٹ کو بیوہ کے بین سے تشبیہہ دی ہے جس کا مقصد سوائے الفاظ کی بازی گری کے اور کچھ نہیں ۔ جب کہ اس کے مقابلے میں آزاد قوم کا آرٹ روح کو گرماتا اور زندگی کو ابدیت بخشتا ہے ۔ اقبال صرف الفاظ کی صناعی کے قائل نہیں ہیں ، کیونکہ الفاظ کی صنعت گری صحیح معنی و مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہوتی ہے غلاموں کا آرٹ محض عوام کی خوشنودی کو مدِ نظر رکھتا ہے اسے صرف عوام کی خوشی سے سروکار ہوتا ہے وہ فطرت کی نقالی کرتا ہے اس کا مقصد حقیقت کو تخیل کی مدد سے اعلیٰ مدارج تک پہنچانا نہیں ہوتا جب کہ ایک ہی آرٹسٹ حقیقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جدت طرازی سے کام لیتا ہے ۔

اقبال لکیر کا فقیر بننا پسند نہیں کرتے اس لیے شاعری میں وہ مصنوعی ضوابط کے پابند نہیں ہیں ۔ اپنے آرٹ کی آزادی کا اقبال نے اپنے پیش روؤں سے اس طرح مقابلہ کیا ہے :

اوروں کا پیام اور ہے میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے
طائر زیرِ دام کے نالے بھی سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ طائر زیرِ دام اور ہے

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر وحید قریشی

علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج

علامہ اقبال ۱۸۹۵ء میں مرے کالج سیالکوٹ سے ایف ۔ اے کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں آ کر داخل ہوئے ۔ دو سال میں بی ۔ اے کرنے کے بعد ۱۸۹۸ء میں انھوں نے فلسفے میں ایم ۔ اے کیا ۔ سیالکوٹ سے لاہور آنے کے بعد پہلا عام جلسہ جس میں علامہ اقبال نے کوئی نظم پڑھی وہ انجمن کشمیری مسلمانان ہند کا تھا ۔ یہ ۱۸۹۶ء کا واقعہ[1] ہے ۔ لیکن انجمن حمایت اسلام کا اسٹیج ان دنوں مسلمانوں کی ثقافتی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا ۔ علامہ کی شہرت کا آغاز اس کے سالانہ جلسوں سے ہوا ۔ ۱۸۹۹ء میں انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں اپنی نظم نالۂ یتیم پڑھی ، جس کی مفصل روداد خلیفہ شجاع الدین مرحوم کے مقالے ''علامہ اقبال انجمن کے جلسوں میں'' — میں پائی جاتی ہے[2] ۔ انجمن کے یہ جلسے اس زمانے میں شیرانوالا ہائی سکول کے صحن میں ہوا کرتے تھے . علامہ اقبال نے انھیں جلسوں میں اپنی بعض اہم نظمیں پڑھیں ۔ علامہ اقبال کا تعلق اس کے بعد سے چلتا رہا ۔

۱۔ ذکر اقبال (سالک) ، ص ۱۸ ۔

۲۔ دیکھیے یہ مقالہ ، حمایت اسلام (ہفت روزہ) کا شجاع الدین نمبر جلد ۳۳ ، شمارہ ۱۵ - ۱۶ ، ۲ مئی ۱۹۵۶ء ، ص ۱۳ - ۱۴ - اس کے علاوہ دیکھیے مختصر تواریخ انجمن حمایت اسلام ، لاہور (طبع ۱۹۳۹ء) ، ص ۱۱ ، (لیکن یہاں ۱۹۰۰ء درج ہے جو صحیح نہیں) نیز حمایت اسلام ، لاہور ، جلد ۳۲ ، نمبر ۱۱ - ۱۵ ، ۲۲ اپریل ۱۹۵۵ء ، مقالہ حکیم محمد حسن قرشی بعنوان اقبال اور انجمن ، ص ۱۳ ۔

وہ سالانہ جلسوں میں اکثر اپنی نظمیں پڑھتے ۔ اس کے علاوہ اسلامیہ کالج سے بھی ان کا تعلق دو دفعہ قائم ہوا ہے ۔ اول بار اس زمانے میں جب خلیفہ شجاع الدین صاحب کالج میں ایف ۔ اے کے طالب علم تھے اور دوسری بار پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں ۔

اسلامیہ کالج سے اولین تعلق کی روداد خلیفہ صاحب نے اپنے مذکورہ بالا مقالے میں یوں بیان کی ہے :

اول الذکر جلسے (۱۸۹۹ء) کے تھوڑے عرصہ کے بعد ہی اقبال کے لیے انجمن سے وابستگی کا ایک اور موقع نکل آیا ۔ شیخ عبدالقادر ان دنوں اخبار ''آبزرور'' کے ایڈیٹر اور اسلامیہ کالج میں ادبیات انگریزی کے پروفیسر تھے ۔ انہیں چند روز کی رخصت لینی پڑی تو ان کی جگہ اقبال مرحوم یہ فرائض انجام دیتے رہے ۔ میں ان دنوں ایف ۔ اے کا طالب علم تھا ۔ نصاب میں Seekers after God یعنی متلاشیانِ حق کے نام سے ایک کتاب شامل تھی جس میں زمانۂ قبل از مسیح کے تین حکماء کی سرگزشتیں درج تھیں ۔ عیسائی مصنف نے ان متلاشیانِ حق کے بعض اقوال کا موازنہ انجیل کی آیات سے کیا لیکن علامہ مرحوم نے کلامِ پاک کی ان آیات سے ان اقوال کی تشریح کی جو ان کے ساتھ مطابقت رکھتی تھیں ۔ موازنہ کے دوران میں آپ یہ بھی ثابت کرتے جاتے تھے کہ قرآن کی آیات ان اقوال سے بدرجہا افضل اور بہر نوع اکمل ہیں ۔ اسلامیہ کالج کی چند روزہ پروفیسری نے ہی آپ کے تبحرِ علمی کا سکہ بٹھا دیا''[1]۔

اس بیان میں بعض باتیں وضاحت طلب ہیں ۔ علامہ اقبال گورنمنٹ کالج سے ایم ۔ اے کرنے کے بعد اورینٹل کالج میں بطور ریسرچ اسکالر کام کرتے رہے ہیں[2] ۔ ظاہر ہے کہ اس سے قبل یا بعد میں اور گورنمنٹ

۱۔ علامہ اقبال انجمن کے جلسوں میں ، ص ۱۵ ۔

۲۔ وہ میکلوڈ پنجاب عربک ریڈر تھے اور جزئی طور پر تدریس کا کام بھی کرتے تھے ۔ یہ روایت صحیح نہیں کہ وہ اورینٹل کالج میں پروفیسر تھے ۔

کالج کی ملازمت سے قبل اس وابستگی کی نوبت آئی ہوگی ۔ اسلامیہ کالج کا قیام شیرانوالہ اسکول میں ۱۸۹۲ء میں عمل میں آیا[1] ۔ پہلے سال میں گیارہ طالب علم تھے اور اس کالج کے لیے اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ میں دو کمرے مخصوص کر دیے گئے ۔ اگلے سال ایک کمرہ اور لیا گیا اور سیکنڈ ایر کی کلاس بھی جاری ہو گئی ۔ ۱۹۰۰ء تک اسلامیہ کالج انھیں تین کمروں پر مشتمل تھا ۔ ۱۹۰۱ء میں ان تین کمروں کے اوپر ایک منزل تعمیر کی گئی اور ۱۹۰۷ء تک اوپر تلے کے یہی چھ کمرے کالج کا کام دیتے تھے[2] ۔ ڈگری کلاسوں کے اجرا کی تجویز ۱۹۰۱ء میں ہوئی لیکن اس پر باقاعدہ عمل ایک سال بعد ہوا ۔ شیرانوالہ اسکول کی اسی عمارت میں علامہ اقبال پڑھاتے رہے ۔ مختصر تواریخ انجمن حمایت اسلام (طبع ۱۹۳۹ء) میں اسلامیہ کالج کے ڈگری تک ہو جانے کے بارے میں ذیل کا اقتباس ملتا ہے :

”۱۹۰۰ء میں اسلامیہ کالج ڈگری کالج تو بنا دیا گیا مگر انجمن کو قلیل تنخواہ پر حسب منشا قابل پروفیسران دستیاب نہ ہوتے تھے ۔ آپ نے (یعنی سر عبدالقادر نے) اس دقت کو محسوس فرمایا اور ۱۹۰۱ء میں جب کہ ”پنجاب آبزرور“ کے چیف ایڈیٹر تھے آپ نے اپنی خدمات بطور اعزازی پروفیسر پیش کیں جو بصد شکریہ قبول ہوئیں ۔ آپ اس خدمت کے لیے اپنے معاونِ خاص خان صاحب شیخ عبدالعزیز اور اپنے عزیز دوست میاں عبدالعزیز صاحب ایم ۔ اے (فلک پیما) کو بھی ہمراہ لائے ۔ چنانچہ کافی عرصہ تک یہ ہر سہ حضرات اس قومی خدمت کو خوش اسلوبی کے ساتھ سر انجام فرماتے رہے“[3] ۔

۱- انجمن کے تعمیری کارناموں کی مختصر سی روئداد (شیخ اکبر علی) فروری ۱۹۴۹ء ، ص ۱۱ ، انجمن حمایت اسلام لاہور کے کارناموں پر سرسری نظر (سید عبدالقادر و شجاع الدین) مارچ ۱۹۴۹ء ، ص ۱۷ (Anjuman-i-Himayat-i-Islam Lahore (N.D.) ، ص ۱۰ ۔

۲- انجمن کے تعمیری کارناموں کی مختصر سی روئداد ، ص ۱۱ ۔

۳- ایضاً

اس سے بخوبی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کالج سے علامہ اقبال کا تعلق ریسرچ اسکالری کے بعد اور گورنمنٹ کالج کی ملازمت سے قبل ہوا ہوگا ۔ غالباً ۱۹۰۳ء میں علامہ اسلامیہ کالج سے متعلق رہے[1] ۔

اسلامیہ کالج کی ملازمت کے دوسرے دور کے بارے میں علامہ اقبال کا اپنا ایک خط موجود ہے ۔ اکبر الہ آبادی کے نام ۲۸ نومبر ۱۹۱۸ء کو لکھتے ہیں :

''جواب دینے میں تاخیر ہوئی جس کے لیے معافی چاہتا ہوں ۔ وجہ یہ ہے کہ آج کل معمول سے زیادہ مصروفیت ہے ۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر فلسفہ ڈاکٹر ہیگ چیچک کی بیماری سے دفعتاً انتقال کر گئے اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے اصرار پر دو ماہ کے لیے کالج کے ایم ۔ اے کی جماعت مجھ کو لینی پڑی ۔ اُمید ہے دو ماہ تک نیا پروفیسر مل جائے گا ۔ لڑکے شام کو ہر روز میرے مکان پر آ جاتے ہیں ۔ دن میں جو تھوڑی بہت فرصت ملتی ہے اس میں ان کے لیکچر کے لیے کتب دیکھتا ہوں ۔ لیکچر کیا انسان کی ذہنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا افسانہ ہے جسے عرفِ عام میں تاریخ فلسفہ کہتے ہیں ۔ ابھی کل شام ہی میں ان کو آپ کا یہ شعر سنا

۱۔ خلیفہ شجاع الدین صاحب کی ایف ۔ اے کی تعلیم کے سنین نہیں مل سکے ورنہ اس کا قطعی فیصلہ ہو جاتا ۔ ۱۹۰۶ء میں خلیفہ صاحب نے ایم ۔ اے انگریزی کیا ، Biographical Encyclopedia of Pakistan Ed. 1955-56 ، ص ۳۷۹ ۔ اس زمانے میں ایم ۔ اے ایک سال کا ہوتا تھا ۔ اس حساب سے مارچ ۱۹۰۳ء میں انھوں نے ایف ۔ اے کیا ہوگا ۔ اسی زمانے میں علامہ اقبال کی ملازمت کا گمان ہو سکتا ہے ۔ اورینٹل کالج کی اسکالری کے بعد اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں چھ ماہ کے لیے ایڈیشنل پروفیسر انگریزی ہوئے (۱۹۰۲ء) بحوالہ 'A History of Govt. College Lahore' ص ۱۱۵ ۔ ۳ جون ۱۹۰۳ء کو انھیں دوبارہ اسی ملازمت پر رکھا گیا (ایضاً) ، دونوں ملازمتوں کے مابین اس کی نوبت آئی ہوگی ۔

رہا تھا

میں طاقتِ ذہن غیر محدود جانتا تھا خبر نہیں تھی
کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تُل کر نظر بھی مجھ کو ملی ہے نپ کر

سبحان اللہ ! کیا خوب کہا ہے ۔ جزاک اللہ !

بہرحال ان لیکچروں کے بہانے سے ان لڑکوں کے کان میں کوئی نہ کوئی مذہبی نکتہ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے :

''جان حاضر ہے مگر راہِ خدا ملتی نہیں''[1]

اس دورِ ثانی تک اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی بلڈنگ میں آٹھ آیا تھا اور کالج کے ایم ۔ اے فلسفہ کے طلبہ اس عمارت سے علامہ اقبال کے مکان پر حاضر ہوا کرتے تھے ۔ علامہ اقبال اس زمانے میں انارکلی میں رہائش رکھتے تھے ۔

کالج سے اُن کے تعلق کی روداد میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ انجمن حمایتِ اسلام سے وابستہ رہے ۔ اپریل ۱۹۳۰ء سے ستمبر ۱۹۳۴ء تک وہ انجمن حمایتِ اسلام کے جنرل سیکرٹری تھے اور ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۷ء تک وہ صدر رہے[2] ۔ ان کی صدارت کے زمانے میں اسلامیہ کالج کے اساتذہ و طلبہ سے علامہ کا تعلق قائم رہا ۔ کالج کے اساتذہ خصوصاً پروفیسر حمید احمد خاں ، کیپٹن عبدالواحد ، ڈاکٹر سعیداللہ علامہ سے اکثر ملتے رہے اور اُن کی محفلوں میں شریک ہوتے رہے اور آخری رابطہ یہ ہے کہ اُن کی ذاتی لائبریری اب اسی کالج کی ملکیت ہے اور اسلامیہ کالج سول لائنز کی ایم ۔ اے لائبریری میں علامہ کی کتابوں کی دو الماریاں کالج سے مرحوم کے تعلقات کی داستان کہتی ہیں ۔

-:O:-

۱۔ اقبال نامہ ، جلد دوم ، ص ۴۳ - ۴۷ ۔
۲۔ مختصر تواریخ ، انجمن حمایتِ اسلام ، ص ۱۲ ۔

کتابیاتِ اقبال

(فاران میں شائع ہونے والے مقالات)

نمبرشمار	نام مضمون	مضمون نگار	بحوالہ
۱-	خودی کا سرِ نہاں لاالہ الااللہ	پروفیسر بشیر چٹھہ	اقبال نمبر دسمبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۲۶-۳۰
۲-	اقبال کا فلسفۂ خودی	میاں ذوالفقار احمد	فاران ۱۹۸۴ء صفحہ ۸۰-۷۶
۳-	اقبال کا تصور خودی	گلزار احمد	۱۹۸۵ء، صفحہ ۵۷-۶۱
۴-	اقبال اور فلسفۂ خودی	سید نعمان محمود	۱۹۸۴ء

اقبال اور قرآن

۱-	اقبال اور قرآن	گلزار احمد	فاران ۱۹۸۴ء صفحہ ۲۴-۲۰

اقبال اور تصورِ پاکستان

۱-	تصورِ پاکستان	ممتاز فاروق	فاران دسمبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۹۲-۸۱
۲-	اقبال اور نظریۂ پاکستان	جمیل اطہر	فاران دسمبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۱۰۰-۹۷

۳۔	اقبال : تصورِ پاکستان کا خالق	سمیع اشرف	فاران دسمبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۹۳-۹۶

اقبال ۔ حکومت

۱۔	اقبال کا نظریہ حکومت و سیاست	سید فصیح الدین آفتاب	فاران فروری ۱۹۶۴ء صفحہ ۲۲-۲۹

عشق

۱۔	اقبال کا نظریۂ عشق	رشید جاوید	فاران جنوری ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۵-۲۱
۲ ۔	اقبال اور عشق	کرامت علی رضوی	فاران جون ۱۹۷۰ء صفحہ ۹۱-۸۷
۳۔	عشق اور عقل	ڈاکٹر یوسف حسین خان	فاران جون ۱۹۷۰ء صفحہ ۶۲-۷۰

شخصیت

۱۔	اقبال کی لفظی تصویر	پروفیسر حمید احمد خان	فاران ۱۹۵۹ء
۲۔	شخصیت اور شاعری	محمد آصف	فاران دسمبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۳۶-۳۹
۳۔	اقبال کی شخصیت اور شاعری	محمد حنیف رامے	مارچ ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۶۰-۱۶۳

۴- اقبال	یونس طاہر	ستمبر ۱۹۷۵ء صفحہ ۲۰-۱۰
۵- معلم اقبال	محمد سرور عالم	فاران جون ۱۹۶۵ء

شاعری

۱- اقبال کی شاعری	محمد زبیر	فاران جون ۱۹۷۰ء صفحہ ۷۱-۷۶
۲- اقبال اور غزل	تنویر ظہور	فاران دسمبر ۱۹۶۷ء صفحہ ۲۲-۲۸
۳- کلام اقبال کے نمایاں موضوعات	عباس طاہر	فاران جنوری ۱۹۷۱ء صفحہ ۶۷-۶۲
۴- اقبال : غزل سے فلسفے تک	توقیر سلیم خان	فاران دسمبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۶۸-۵۵

خطوط

۱- اقبال : خطوط کے آئینہ میں	سید رضا کاظمی	فاران دسمبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۷۲-۶۷

خطبات

۱- خطباتِ اقبال	ظفرالحق ظفر	فاران دسمبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۲۵-۲۰

اشتراکیت

۲۔ اقبال اور اشتراکیت — ندیم احمد — فاران
جون ۱۹۷۰ء
صفحہ ۸۲-۸۶

اقبال - اسلامیہ کالج

۱۔ علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج — پروفیسر محمد صدیق — فاران ۱۹۸۵ء
صفحہ ۷-۳۳

۲۔ علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج — ڈاکٹر وحید قریشی — فاران ۱۹۶۲ء
صفحہ ۷۹-۸۲

تعلیم

۱۔ اقبال کے تعلیمی نظریات — محمد احمد مخدوم — فاران
دسمبر ۱۹۷۷ء
صفحہ ۵۰-۵۴

عورت

۱۔ اقبال کی نظر میں عورت کا مقام — عقیل احمد چوہدری — فاران
جون ۱۹۶۵ء
صفحہ ۱۲-۱۲

فن

۱۔ اقبال کا تصور فن — مس خالدہ ناہید — فاران
مارچ ۱۹۶۵ء
صفحہ ۲۴-۳۲

شاہین

۱۔ اقبال کا شاہین — حسن محمود — فاران
دسمبر ۱۹۷۶ء
صفحہ ۹۴-۹۷

معیشت

۱۔ اقبال کا تصور معیشت — افتخار زاہد — فاران
مارچ ۱۹۷۲ء
صفحہ ۱۱۹-۱۱۳

F A R A N

1.	IQBAL AND MILTON by Prof. Bashir Ahamd Chaudhry	Faran 1984.
2.	A STUDY OF "SHIKWA" AND JAWAB-E-SHIKWA" by Tahir Javed	Faran 1984.
3.	IQBAL AND YEATS by Mustehsan Farooq	September 1979
4.	THE UNIVERSAL NOTE IN IQBAL'S POETRY. by Prof. Hamid Ahmed Khan	December 1977
5.	WORDSWORTH AND IQBAL by Mohammad Siddiq.	December 1977
6.	SELF IN THE LIGHT OF RELATIVITY. by Dr. Sir Iqbal	Faran 1984
7.	THE RECONSTRUCTION OF THOUGHT IN IQBAL by Irshad-ul-Hasan	December 1977
8.	IQBAL'S CONCEPTION OF GOD. by Mohammad Aslam Warsi	December 1977
9.	IQBAL: A REFORMER IN THE GARB OF A POET by Akhtar Hussain	December 1977
10.	A GREAT THINKER by S.M. Arif Iqbal	Faran 1984

of the subconscious mind and become inaccessible to conscious reason ever afterwards except through extra-ordinary up-heavals or psycho-analytical probings. As a poet with great sensitivity he reacted to the influences that emanated from the environment or from his early education.......... The simple explanation is the evolution of the poet who continued extending the frontiers of his knowledge and emotions---a gradual process of universalisation and almost cosmic expansion."

Faran.
April, 1959.

mysticism. He wants mysticism in its pure and unmixed form, which should stimulate a spirit of life and activity in the self of man.

So it becomes evident that he has not passed his final judgments over these topics, which should be taken as contradictory to his later sayings. As a matter of fact when he came to settle down in his country, after his visit to Western laboratory of knowledge, he was neither a communist nor a fascist, but he was a Muslim first and Muslim last. He is a thinker among Muslims who can be very easily placed second to Ibn-i-Khuldun.

The matter in this connection, which requires consideration is, that in this world, there is no born genius, born scholar and born hero. Every one of the great personalities is the product of his own achievements. The American author Emerson is right in saying that a genius is ninety nine per cent perspiration and one per cent inspiration.

Now there is continued evolution in human life. Capacities differ according to age and knowledge, Iqbal was no exception to it. He adopted his career as diehard nationalist. His poem on "Hamala" and "Nia Shawala" are the very proof of it. But this nationalism started sinking after a decade or so. It is not only Iqbal's case, it is the case of every philosopher. Now the contradictions can be understood as the land marks of Iqbal's evolutionary thought.

Dr. Khalifa Abdul Hakim has remarked very aptly in his article entitled Iqbal's attempts at creative synthesis,: that his was not a static and stereotyped mind which imbibes certain doctrines from his parents or his communal or social environment at a very early stage and these borrowed beliefs sink into the abysses

deep one goes into his thought the more clear he becomes. We can judge Iqbal from two angles in this respect.

The first way to study Iqbal is to assess his position regarding the Western Philosophy. Now, the fact is that Iqbal with his fund of knowledge, deep thinking and great analytical capabilities, is a visitor to the intellectual laboratory of the West. In a laboratory there are different specialist engaged in different types of researches. He enters just to find out what they are doing. The nature of inspection is of inquisitive type. In each process of research he finds out some fundamental goodness and he praises it, leaving aside the inherent defects of the system under examination. This praise which he purse on different ideologies, is just momentary. Here is a point for the consideration of the learned critics of Iqbal. If he makes any passing remarks of commendation about any ideology, it is momentary and not final. He has withheld his final judgment which will be issue after he has gone through the whole case. This is one phase of Iqbal's thought which has rarely been taken into consideration with the result that even the student who wants to study him objectively is faced with grave complexities. It is clear that one should not think Iqbal as Communist, when he says that:-

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں بندۂ مزدور کے اوقات بہت تلخ

He only examines here the injustices done by the capitalist system, and describes them. Again he is not to be labelled as fascist when he praises Mosoullini. We have seen that Iqbal is a believer of the dynamic philosophy of life. What appeals to him in Mosoullini is his dynamism and nothing else. He is not to be blamed as the enemy of mysticism, because he has criticised the so-called "soofis" in his poetry. What he hates is static view of life, which has been associated with

must have in view the contemporary world around our thinker.

It is sunlit reality that the world where Iqbal lived, was a world of Muslim nation. This nation after passing her prime of life, had been eclipsed and was under the tight bonds of slavery. About a century of subjugation had stagnated their minds and actions. They were lifeless and without any activity.

Iqbal was of the opinion that this stagnation was the very negation of life. He earnestly believed that until and unless Muslims woke up from their deep slumber, there was no hope of their continued existence. In "Armughan-i-Hijaz" be explains this fact beautifully:--

موت سے ہے سخت تر جس کا غلامی ہے نام
مکر و فن خواجگی کاش سمجھتا غلام !
شرع ملوکانہ میں جدت احکام دیکھ !
صور کا غوغا حلال حشر کی لذت حرام !
اے کہ غلامی سے ہے روح تری مضمحل !
سینۂ بے سوز میں ڈھونڈھ خودی کا مقام !

Indeed he says that the bondage of slavery has almost extracted the very spirit of life. This was his goal to make the Muslims realise that for their survival, they would have to shake off their clumsiness and to peep into their own selves. So having this object in mind we proceed to examine the contradictions in his thought.

It is alleged that Iqbal is not consistent in his view over any topic, he has dealt with. And ass he has dealt with life as a whole, so he has dealt with every topic of life. The logical conclusion would be that Iqbal is not consistent in his views about the nature of "life " itself. There is no denying that at the first instance every student of Iqbal feels like that, but it is very superficial view of the fact. The more

BEDAR MALIK

CONTRADICTIONS IN IQBAL'S THOUGHT

Every critic who takes his pen in hand to analyse the elements of Iqbal's thought, faces the problem of "contradictions." The result is that most of the superficial critics declare that Iqbal's thought is a hotchpotch of contradictions. I agree with a friend of Iqbal, who wrote once in an Urdu Magazine, that there are three who have been victimised in Islam very unjustly. The first, he thought was the Quran, which is adorned with colurful clothes, kept on high places, recited in cocktail parties and at the occasion of the openings of cinema house, but is never put into practice. The second was Iman Hussain, who fought very bravely for the cause of Islam, but the spirit of his bravery is never taken into account and he is mourned as if he did something very bad. The last victim he thought was Iqbal, who probed into the bosom of the western thought and then gave a vision to the Muslims for their betterment. "The tragedy is" he wrote, "that no one cares to understand the real depth of his thought. On the contrary some of his verses are being used for 'Quawalis' which deal with music as narcotic and harmful for life". For example I heard a "Quawali" in which the following verses were the burden of the song:-

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول ، طاؤس و رباب آخر

Here lies the real point. The fact is that these so called "Critics" of Iqbal have never tried to go deep and find out the real spirit of his thought. In order to understand the essence of his philosophy we

I gazed from Hampstead's breezy heath.
As if but yesterday depasted,
Thou too art gone before; but why,
O'er ripe fruit, seasonably gathered,
Should fail survivors heave a sigh?
Mourn rather for that holy Spirit,
Sweet as the spring, as ocean deep;
For Her who, ere her summer faded,
Has sunk into a breathless sleep,
No more of old romantic sorrows,
For slaughtered Youth or love-lorn Maid!
With sharper grief is Yarrow smitten,
And Ettrick mourns with her their Poet-dead.

This volume is actually the soul of Wordsworth's "Poetical works". The composer has added an index of all poems with much labour and diligence. It is of two types. The first deals with the year of the writing of the poem whereas the second one contains the first line of every poem. All the first lines of the poems have been composed alphabetically to make an excellent index. Against every first line of the poem has been given page number and reference to the Volume which facilitates the reader to find out the poem.

Allama Iqbal was an ardent admirer of Wordsworth. He was well-versed with the western literary thought. Any thing which was a harmony with his thoughts was atonce appreciated and acknowledged by him. A careful reader of both the poets can easily trace points of similarity in thought, attitude, and inspiration of Iqbal and Wordsworth.

(Translated by Altaf Hussain, Student M.A. English)

EXTEMPORE EFFUSION UPON THE DEATH OF JAMES HOGG

(He died, at Altrive, on the 21st November, 1835)

WHEN first, descending from the moorlands,
I saw the Stream of Yarrow glide
Along a bare and open valley
The Ettrick Shepherd was my guide
When last along its banks I wondered.
Through groves that had begun to shed
Their golden leaves upon the pathways,
My steps the Border-minstrelled
The mighty Minstrel breathes no longer,
Mid mouldering ruins low he lies
And death upon the braes of Yarrow,
Has closed the Shephered-poet's eyes:
Nor has the rolling year twice measured,
From sign to sign, its steadfast course,
Since overy mortal power of Coleridge
Was frozen at its marvellous source;
The rapt one, of the godlike forehead,
The heaven-eyed creature sleeps in earth:
And lamb, the frolic and the gende,
Has vanished from his lonely hearth
Like clouds that rake the mauntain-summits,
Or waves that own no curbing hand,
How fast has brother followed brother,
From sunshine to the sunless land!
Yet I, whose lids from infant slumber
Where earlier raised, remain to hear
A timid voice, that asks in whispers,
"Who next will drop and disappear?
Our haughty life is crowned with darkness,
Like London with its own black wreath,
On which with thee, O Crabee! forth-looking,

But long as cock shall crow from household perch
To rouse the dawn, soft gales shall speed thy wing,
And thy erratic voice be faithful to the spring!

The 8th volume of Wordsworth's "poetical works" was brought to the public in 1886. It consists of 435 pages. Iqbal has marked only one long poem in the contents of this volume. The title of poem is "Extempore Effusion upon the Death of James Hogg". This poem is actually an extempore elegy which was written on the death of James Hogg (1770--1835). The elegy mentions the death of literary figures. They were all very close to Wordsworth. Wordsworth had met James Hogg in 1803 for the first time. The elegy was written in 1835 and published in 1836 for the first time.

This volume also includes the following prose writing of Wordsworth.

1) Guide to the Lakes.
2) Letters on the Kendal and Windermere Railway

1) Guide to the Lakes:-

In this long essay Wordsworth had described the beautiful scenes of the lakes in the northern parts of England. Their geographical conditions have also been mentioned in this essay.

2) The Kendal and Windermere Railway.

It consists of two long letters which were published in the "Morning Post"

comparative study of the poem, which Iqbal has underlined with a black pencil. The composer is of the opinion that Shelley's (1792-1822) poem is more subtle and delicate than these two of Wordsworth Iqbal has underlined the following words from the composer's critical note.

Compare this with earlier poem TO A SKY LARK, written in 1805 and both poems with Shelley's still finer lyric to the same bird, written in 1820. See also the Morning Exercise (1828), stanzas 5.10--Ed.

This poem was written in 1827 and published in the same year. It appears on page 163 of the volume. It has been marked only in the 'contents'. No line in the original poem has been found underlined.

Wordsworth wrote another poem under the same title in 1804 which was published in 1807 and appears on page 1 of the third volume. The following poem was written after 23 years of the previous one.

TO THE CUCKOO

Not the whole warbling grove in concert heard
When sunshine follows shower, the breast can thrill
Like the first summons, Cuckoo! of thy bill,
With its twin notes inseparably paired
The captive 'mind damp vaults unsunned, unaired,
Measuring the periods of his lonely doom,
That cry can reach; and to the sick man's room
Sends gladness, by no languid smile declared.
The lordly eagle-race through hostile search
May perish; time may come when never more
The wilderness shall hear the lion road;

Alms may be needed which that House bestowed?
Can they, in faith and worship, train the mind
To keep this new and questionable road?

3) To Sky Lark.

Included in the course of English literature, this poem ranks among the most famous poems of Wordsworth. It appears on page 139 of the volume. It was written in 1825 and published in 1827. While studying this poem Iqbal did not mark any line of it.

Wordsworth had written a poem, in 1805, with the same title, which was published in 1807 and appears on page 34 of the third volume. That poem is also included here.

This is the poem.

ETHEREAL minstrel ! pilgrim of the sky!
Dost thou despise the earth where cares abound?
Or, while the wings aspire, are heart and eye
Both with thy nest upon the dewy ground?
Thy nest which thou canst drop into at will,
Those quivering wings composed, that music still!
Leave to the nightingale her shady wood;
A privacy of glorious light is thine:
When thou dost pour upon the world a flood
Of harmony, with instinct more divine:
Type of the wise who soar, but never roam;
True to the kindred points of Heaven and Home!

The composer has added a critical note and a

That swells the bosom of our passing sail!
For where, but on this River's margin, blow
Those flowers of chivalry, to bind the brow
Of hardihood with wreaths that shall not fail?
Fair Court of Edward! wonder of the world!
I see a matchless blazonry unfurled
Of wisdom, magnanimity, and love;
And meekness tempering honourable pride;
The lamb is crouching by the lion's side,
And near the flame-eyed eagle sits the dove

2) Continued (Sonnet)

It appears on page 51 of the book. It has also been found unmarked except in "the content" where the title of the poem is marked with a pencil. Following is the sonnet.

SONNET

YET many a Novice of the cloistral shade,
And many chained by vows, with eager glee
The warrant hail, exulting to the free;
Like ships before whose keels, full long embayed
In polar ice, propitious winds have made
Unlooked-for outlet to an open sea,
Their liquid world, for hold discovery
In all her quarters temptingly displayed!
Hope guides the young; but when the old must pass
The threshold, whither shall they turn to find
The hospitality--the alms (alas!

marked this poem with a pencil only in "the contents". It is also included in the course of English literature.

Some of the prose-writings of Wordsworth have also been included in this volume. Iqbal has marked Wordsworth's famous essay "On Poetic Diction" in "the contents" of the book. This essay stretched from page 305 to page 310. Iqbal has not marked any line in the original essay.

The 7th volume of Wordsworth's Poetical Works" was published in 1885. It consists of 400 pages. Following poems in "the contents" of this volume have been found marked by Iqbal with a pencil.

1) Continued
2) Continued
3) To a Sky Lark
4) To the Cuckoo

1) Continued.

It appears on page 39 of the volume. Except its title, in the 'contents' Iqbal has marked neither the original poem nor the critical note on it. This is the sonnet.

CONTINUED

And what melodius sounds at times prevail!
And, ever and anon, how bright a gleam
Pours on the surface of the turbid steam!
What heartfelt fragrance mingles with the gale

Hence have I genial seasons, hence have I
Smooth passions, smooth discourse, and joyous thought:
And thus from day to day my little boat
Rocks in its harbour, lodging peaceably.
Blessings be with them--and eternal praise,
Who gave us nobler lover, and nobler cares--
The Poets, who on earth have made us heirs
Of truth and pure delight by heavently lays!
Oh! might my name be numbered among theirs,
Then gladly would I end my mortal days.

THE WORLD IS TOO MUCH WITH US

THE world is too much with us; late and soon
Getting and spending, we lay waste our powers:
Little we see in Nature that is ours;
We have given our hearts away, a sordid boon:
This sea that bares her bosom to the moon;
The winds that will be howling at all hours
And are up-gathered now like sleeping flowers;
For this, for everything, we are out of tune
It moves us not.----Great God! I'd rather be
A Pagan suckled in a creed outworn;
So might I, standing on this pleasant lea,
Have glimpses that would make me less forlorn
Have sight of Proteous rising from the sea;
Or hear old Triton blow his wreathed horn.

This sonnet appears on page 32 of the book. It was written in 1806 and published in 1807. Iqbal has

Are fostered by the comment and the gibe."
Even be it so: yet still among your tribe,
Our daily world's true Worldlings, rank not me!
Children are blest, and powerful: there world lies
More justly balanced; partly at their feet,
And part far from them;---sweetest melodies
Are those that are by distanced made more sweet;
Whose mind is but the mind of his own eyes,
He is a Slave; the meanest we can meet!

III

Wings have we,---and as far as we can go
We may find pleasure; wilderness and wood,
Blank ocean any merely sky, support that mood
Which with the lofty sanctifies the low.
Dreams, books, are each a world; and books, we know,
Are a substantial world, both pure and good;
Round these, with tendrils strong as flash and blood,
Our pastime and our happiness will grow.
There find I personal themes, a plenteous store,
Matter wherein right voluble I am,
To which I listen with a ready ear;
Two shall be named, pre-eminently dear,
The gentle Lady married to the Moor;
And heavenly Una, with her milk-white Lamb.
Nor can I not believe but that hereby
From evil-speaking; rancour, never sought,
Comes to me not; malignant truth, or lie.

Wordsworth himself relates that he and his sister used to talk in their sitting-room, with their kettle of tea always on the stove. This poem was the result of these sittings.

I

I am not One who much or oft delight
To season my fireside with personal talk,
Of friends, who live within an easy walk,
Or neighbours, daily, weekly in my sight
And, for my chance-acquaintance, ladies bright,
Sons, mothers, maidens withering on the stalk,
These all wear out of me, like Forms with chalk
Painted on rich men's floors, for one feast night
Better than such discourse doth silence long,
Long, barren silence, square with my desire;
To sit without emotion, hope, or aim,
In the loved presence of my cottage-fire,
And listen to the flapping of the flame,
Or kettle whispering its faints undersong.

II

"Yet life," you say, is life; we have seen and see,
And with a living pleasure we describe;
And fits of sprightly malice do but bribe
The languid mind with activity.
Sound sense and love itself, and mirth and glee

PERFATORY SONNET

It appears on page 20 of the volume. Written in 1806, this sonnet was published in 1807. Wordsworth is supposed to have said that once in 1801 his sister was reading Miltons, sonnets to him which impressed him very much. The following sonnet is the result of that impact. This sonnet has been marked only in the contents.

> NUNS fret not a their convent's narrow room;
> And hermits are contented with their cells;
> And students with their pensive citadels;
> Maids at the wheel, the weaver at this loom,
> Sit blith and happy; bees that soar for bloom,
> High as the highest Peak of Furness-fells,
> Will murmur by the hour in forglove bells:
> In truth the prision, unto which we doom
> Ourselves, no prison is; and hence for me,
> In sundry moods, 'twas pastime to be bound
> Within the Sonnet's scanty plot of ground;
> Pleased if some Souls (for such there needs must be)
> Who have felt the weight of too much liberty,
> Should find brief solace there, as I have found.

PERSONAL TALK

Written in 1608, this long poem was published in 1807, Iqbal marked this poem only in "the contents"

At length upon the Shepherd's mind
It breaks, and all is clear;
He instantly recalled the name,
And who he was, and whence he came;
Remembered, too, the very day
On which the Traveller passed this way.
But hear a wonder, for whose sale
This lamentable tale I tell!
A lasting monument of words
This wonder merits well.
The Dog, which still was hovering nigh,
Repeating the same timid cry,
This dog had been through three months'
space
A dweller in that savage place.
Yes, proof was plain that, since the day
When this ill-fated Traveller, died,
The Dog had watched about the spot,
Of by his master's side:.
How nourished here through such long time
He knows, who gave that love sublime;
And gave that strength of feeling; great
above all human estimate

The fourth volume of Wordsworth's "Poetical Works" composed by William Knight consists of 387 pages. It was published in 1883. While studying this volume Iqbal has marked the following poems in the "contents".

(1) Prefatory Sonnet.
(2) Personal Talk.
(3) The world is too much with us.
(4) On Poetic Diction.

Glancing through that covert green,
The Dog is not of mountain breed;
Its motions, too, are valid and shy;
With something, as the Shepherd think,
Unusual in its cry;
Nor is there any one is sight
All round, in hollow or on height;
Nor shout, nor whistle strikes his ear;
What is the creature doing here?
It was a cove, a huge recess,
That keeps, till June, December's snow;
A lofty precipice in front,
A silent tarn below!
Far in the bosom of Helvellyn,
Remote from public road or dwelling,
Pathway, or cultivated land;
From trace of human foot or hand,
There sometimes doth a leaping fish
Send through the tarn a lonely cheer;
The crags repeat the reven's croak,
Is symphony austere;
Thither the rainbow comes--the cloud--
And mists that spread the flying shroud;
And sunbeams; and the sounding blast,
That, if it could, would hurry past;
But that enormous barrier holds it fast.
Not free from boding thoughts a while
That Shepherd stood; then makes his way
O'er rocks and stones, following the Dog
As quickly as he may;
Nor far had gone before he found
A human skeleton on the ground;
The appalled Discoverer with a sigh
Looks round, to learn the history.
From those abrupt and perilous rocks
The Man had fallen, that place of fear!

FIDELITY

This elegy was written in 1805 and published in 1807. Instead of the poem itself, Iqbal has marked the following lines in the critical note on this poem written by the poet himself.

Iqbal has also underlined the following four lines in the poet's note about the last four verses of the last stanza.

Compare this poem with Shelley's Skylark, and with Wordsworth's poem, on the same subject, written in the year 1825. It was placed amongst the "Poems of the Fancy."--Ed.

The young man whose death gave occasion to this poem was named Charles Gough, and had come early in the spring to Patterdale:

I will add that the sentiment in the last four lines of the last stanza of my verses was uttered by a shepherd with such exactness, that a traveller, who afterwards reported his account in print, was induced to question the man whether he had read them, which he had not)

A BARKING Sound the Shepherd hears.
A cry as of a dog or fox;
He halts--and searches with his eyes
Among the scattered rocks:
And now at distance can discern
A stirring in a brake of fern;
And instantly a god is seen,

Up with me, up with me into the clouds!
Singing, singing,

With clouds and sky about thee ringing,
Lift me, guide me till I find

That spot which seems so to thy mind!
I have walked through wildernesses dreary
And to-day my heart is weary;
Had I now the wings of a faery,
Up to thee would I fly
There is madness about thee, and joy divine
In that song of thine;
Lift me, guide me high and high
To thy banqueting-place in the sky.
Joyous as morning

Thou art laughing and scorning;
Thou hast a nest for thy love and thy rest,
And, though little troubled with sloth,
Drunken Lark! thou would'st be loth
To be such a traveller as I.
Happy, happy Liver,

With a soul as strong as a mountain river
Pouring out praise to the almighty Giver,
Joy and jollity be with us both!

Alas! my journey, rugged and uneven,
Through prickly moors or dusty ways must wind;
But hearing thee, or others of thy kind,
As full of gladness and as free of heaven,
I, with my fate contented, will plod on,
And hope for higher raptures, when life's day is done.

upon the imaginative faculty, than an exertion of it. The one which follows is strictly a Reverie; and neither that, nor the next after it in succession, "The Power of Music," 'would have been placed here, but for the reason given in the foregoing note."

The being "placed here" refers to its being included amongst the "Poems of the Imagination:" and the "Foregoing note" is the note.

"They flash upon that inward eye
Which is the bliss of solitude."

Iqbal has also underlined the following lines in the critical note of the poem written by the composer. The composer is of the opinion that these lines are not the poet's own rather been said by his wife.

TO A SKYLARK

Written in 1805 this poem was published in 1807. Another poem on the same topic; written in 1825 and published in 1827, has also been mentioned in this essay. Iqbal has marked the following lines in critical note on this poem.

The composer is of the opinion that Shelley's (1792-1822) poem written on the same topic (To a Skylark) is more beautiful and subtle than both the poems of Wordsworth. For a comparative study of both the poems, Shelley's poem is also given below:

Up with me! up with me into the clouds!
For thy song, Lark, is strong;

included in the course of English literature. Iqbal has underlined the following verses in this poem.

"They flash upon that inward eye
Which is the bliss of solitude."

This is the whole poem:

I WONDERED lonely as a cloud
That floats on high o'er vales and hills,
When all at once I saw a crowd,
A host, of golden daffodils;
Besides the lake, beneath the trees,
Fluttering and dancing in the breeze.
Continuous as the stars the shine
And twinkle on the milky way,
They stretch in never-ending line
Along the margin of a bay:
Ten thousand saw I at a glance,
Tossing their beads in sprightly dance.
The waves beside them danced; but they
Out-did the sparkling waves in glee:
A poet could not but be gay,
In such a jocund company:
I gazed--and gazed--but little thought
What wealth the show to me had brought:
For oft, when on my couch I lie
In vacant or in pensive mood,
They flash upon that inward eye
Which is the bliss of solitude;
And then my heart with pleasure fills,
And dances with the daffodils.

to the following effect:-- "The subject of these stanzas in rather an elementary feeling and simple impression (approaching to the nature of an ocular spectrum)

O Cuckoo! shall I call thee Bird,
Or but a wandering Voice?·
While I am lying on the grass
Thy twofold should I hear,
From hill to hill it seems to pass,
At once far off, and near.
Thou babling only to the Vale,
Of sunshine and of flowers,
Thou bringest unto me a tale
Of visionary hours.
Thrice welcome, daring of the Spring!
Even yet thou art to me
No bird, but an invisible thing,
A voice, a mystery;
The same whom in my school-boy days
I listened to; that Cry
Which made me look a thousand ways
In bush, and tree, and sky.
To seek thee did I often rove
Through woods and on the green;
And thou wert still a hope, a love;
Still longed for, never seen,
And I can listen to thee yet;
Can lie upon the plain,
And listen, till I do beget
That golden time again.
O blessed Bird! the earth we pace
Again appears to be
An substantial, faery place;
That is fit home for thee!

THE DAFFODILS

Written in 1804 this poem was published in 1807. It appears on pages 5 and 6 of this volume. It is also

book. Iqbal has underlined this note which is given below:

(Note), The Third volume of the Poets' work was brought out in 1883. It consists of 424 pages and as The Solitary Reaper was written in 1803, and published in 1807 it could not have been to the printed volume that Wordsworth referred. The difficulty is cleared up by the note appended to the edd. 1807 and 1815. "This poem was suggested by a beautiful sentence in a MS. Tour in Scotland, written by a Friend, the last line being taken from it verbatim." I have received some additional information about this MS, and Wordsworth's knowledge of it from Mr. Wilson Robinson of Whinfell-ball, Cockermouth, to whom I have been also indebted for an account of THE LORTON YEW TREE (see p.323).

Iqbal has marked the following poems in The Contents' of this volume.

1) To The Cuckoo
2) The Daffodils.
3) To Sky Lark.
4) Fidelity.

TO THE CUCKOO

This poem was written in 1804 and published in 1807. It is one of the most famous poems of Wordsworth. It is included in the curriculum of English literature. While studying this volume Iqbal did not mark this poem. It has been marked only in the "contents".

O BLITHE New-comer! I have heard,
I hear thee and rejoice.

A voice so thrilling never was heard[1]
In spring-time from the Cuckoo-bird,
Breaking the silence of the seas
Among the farthest Hebrides.
Will no one tell me what she sings?
Perhaps the plaintive number flow
For old, unhappy, far-off things,
And battles long ago:
Or is to some more humble lay,
Familiar matter of to-day?
Some natural sorrow, loss, or pain,
That had been, and may be again?
Whate'er the theme, the Maiden song
As if her song could have no ending;
I saw her singing at her work,
And o'er the sickle bending:-
I listened, motionless and still;[2]
And, as I mounted up the hill,[3]
The music in my heart I bore,
Long after it was heard no more.

Professor William Knight has written a critical note on this poem which appears on page 347 of the

---

1. 1836
   No sweeter voice was ever heard 1807
   Such thrilling voice was never heard 1827

2. 1820
   I listened till I had my fill 1807

3. 1807
   And when I mounted 1827
   And as 1836

Delights us. Rapine, avarice, expense,
This is idolatory; and these we adore:
Plain living and high thinking are no more:
The homely beauty of the good old cause
Is gone; our peace, our fearful innocence,
And pure religion breathing household laws.

(3) The Solitary Reaper: Wordsworth wrote this poem in 1803 and published in 1807. It appears on page 345 of the book. It is one of the most famous poems of Wordsworth. It is a very fine sonnet especially in respect of the theme. Iqbal has marked the poem in the "contents" of this volume but we find no mark on page 345 where this poem stands. This is the poem;

THE SOLITARY REAPER

Comp. 1803---Pub. 1803.

BEHOLD her, single in the field,
Yon solitary Highland Lass°
Reaping and singing by herself;
Stop here, or gently pass°
Alone she cuts and binds the grain,
And sings a melancholy strain;
O listen ° for the vale profound
Is overflowing with the sound.
No Nightingale did ever chaunt
More welcome notes to weary hands[1]
Of travellers in some shady haunt,
Among Arabian sands:

---

1. 1827
So sweetly to reposing bands. 1807

volume. Iqbal has marked the title of this sonnet which indicates that he did study the sonnet. Following is the copy of the sonnet:

EARTH has not any thing to show more fair:
Dul would he be of soul who could pass by
A sight so touching in its majesty:
This City now doth, like a garment, wear
The beauty of the morning; silent, bare,
Ships, towers, domes, theatres, and temples lie
Open unto the fields, and to the sky;
all bright and glittering in the smokeless air.
Never did sun more beautifully steep
In his first splendour, valley, rock, or hill;
Ne'er saw I, never felt, a calm so deep!
The river glideth at his own sweet will:
Dear God. the very houses seem asleep:
And all that mighty heart is lying still!

(2) Composed upon Westminster Bridge. Written in London: This sonnet was written in September 1802 and published in 1807. It appears on the page 300 of the book. Wordsworth visited France on July 30, 1802 and stayed there till September. During his stay he himself experienced the impacts of French revolution and made a comparative study of England and France.

This sonnet is one of the most well-read poems of Wordsworth and is included in curriculum of English literature. Iqbal has tick marked the title of the sonnet in this way (V) The sonnet is given below:

O FRIEND. I know not which way I must look
For comfort, being, as I am, opprest,
I think that now our life is only drest
For show; mean handy-work of craftsman, cook,
Or groom. -- We must run glittering like a brook
In the open sunshine, or we are unblest;
The wealthiest man among us is the best:
No grandeur now in nature or in book

and the opinion of his contemporary men of letters have also been utilised fully.

The composer has included a few more poems which so far had been obscure but have now been published for the first time. In the beginning of every poem a brief space has been given as to the year of its writing and publishing. A comparative study of the poet's "works" has also been added in the book.

While reading the book Allama Iqbal has marked the "contents" of some of the volumes whereas in some volumes only the poems and their critical notes have been underlined. No mark has been found in the Ist, 5th and 6th volumes whereas in the volumes 2nd, 3rd 4th, 7th and 8th, besides their contents, some of the poems with their critical notes haver also been marked. But Iqbal did not write criticism or put his signature on any one of the volumes. No mark has been found that could help in guessing the date of the purchase of the book. The detail of every volume can be had in the following.

The second volume which was published in 1882, consists of 396 pages, Iqbal has marked the following poems in the contents of this volume.

(1) Westminster Bridge.
(2) London.
(3) The Solitary Reaper.

(1) Composed on Westminster Bridge, Wordsworth wrote this sonnet on July 30 , 1803 and published in 1807. Prof. William Knight quotes Dorothy Wordsworth "on July 30 1803 Wordsworth and I, on our way to Dover, crossed Westmjnster Bridge early in the morning between 5 and 6. We were riding on the roof of a coach. It was a pleasant morning and Wordsworth wrote this poem in a very sweet mood, prompted by the fineness of the scene." This sonnet appears on page 287 in the second

MOHAMMAD SIDDIQ

WORDSWORTH AND IQBAL

"Wordsworth saved me from atheism in my student days" says Iqbal, and his opinion, as a spokesman of the East and Critical Observer of the West, cannot, be underestimated, He had Wordsworth's "Poetical works" (Now in Islamia College Civil Lines, Lahore) in his personal library. A few remarks made by Allama Iqbal and certain similarities are worth-noticing.

The book is entitled WILLIAM WORDSWORTH,

Wordsworth's Poetical Works (8VOl.)
Edited by
Prof. William Knight Angus

Wordsworth's 'poetical works' is edited by Prof. William Knight. The book which consists of 8 volumes and 3168 pages, includes 904 poems and was published by Mr. William Paterson, a well known publisher of Edinburgh. The first and the second volumes of the book were brought out in 1882. The 3rd and the 4th in 1883; the 5th and the 6th in 1884, the 7th in 1885 and the last in 1886. So the whole process of composition and editing took long period of five years. The composer has exercised a large amount of deligence and enormous care in the composition of the book. During the course of composition a part of attention has also been devoted to the prevalent historical, political and social circumstances of Europe and the development of the poet's mind has been ascertained in this context. Besides the poet's personal prose writings, letters, critical essays and reviews on his poetry in different magazines, the opinions of his companions have also been given due place in the criticism on his 'Works, Furthermore the memoirs of his wife, sister or friends

Iqbal's universe is alive with hope and light and motion; despair and darkness and rest are unknown to him. In him there is no compassionate exaggeration of individual sorrow and pain, no trace of morbid self-pity. The man was too big for that sort of whining lyricism. His poetry urges us forward to an ideal which is never attained, for there is always one still higher. He puts us on to a struggle from which there is not respite; for when we cease, we die. There is only one mood in Iqbal but, in that exalted mood, he will continue to be the greatest poet of the world as long as men put their shoulder to the wheel of life and throw a challenge to the stars.

Faran.

December, 1977

vision, like Lucretius and Iqbal. It will be clear that poets of conceptual vision call, initially, for different intellectual response as against poets of graphic vision. Thus we have Lucretius (in Book IV).

I am blazing a trail through pathless tracts of the Muses' Pierian realm, where no foot has ever trod before. What joy it is to light upon virgin springs and drink their water. What joy to pluck new flowers and gather for my brow a glorious garland from fields whose blossoms were never yet wreathed by the Muses round any head. This is my reward for struggling to loose men's minds from the tight knots of superstition and shedding on dark corners the bright beam of my song that irradiates everything with the sparkle of the Muses.

The difference here is between the description of things and the description of ideas. Readers of graphic poetry will possibly be more numerous than readers of conceptual poetry. But it should be clearly understood that popularity in itself is not universality, nor should the scope of a poet be judged in terms of the number of his readers. the story of Jack and the Bean-stalk, for instance, counts it readers in millions, but it is not on that account "more universal" than a Dialogue of Plato.

Poetry that exhorts and poetry that entertains satisfy two very different needs of humanity. Both needs are vital and universal, and poetry that satisfies the one is not, therefor, less or more than poetry that satisfies the other. Moreover, it is well to remember that Iqbal is, like Wordsworth or Milton, a poet with a message. Poetry with a message must always be directed to one specific aim, and not to its opposite. Thus, Iqbal has his own specific purpose. He will not lull us to sleep; he will lash us into action. It is not for a soothing syrup that we go to his fountain, but for a draught as bitter as life.

The superb Urdu poem, "Lenin in the Presence of God", is only one illustration of how Iqbal's heart goes out to man whenever and wherever he may be plundered and exploited. During Iqbal's time, England was the reigning world-imperialism and Iqbal had, in a sence, fought England all his life. But it was a humanitarian, not a sectarian, fight; and in the end, Iqbal saw peace, not conflict. He wrote thus (to Sir Francis Younghusband) in 1931:

> I am looking forward to the day when the disputes between England and India will be settled, and the two countries will begin to work together, not only for their mutual benefit, but for the greater good of mankind.

In January, 1938, he made what is probably his last public pronouncement on the Civil War in Spain:

> This one event shown clearly that national unity, too, is not a very durable force. Only one unity is dependable and that unity is the brotherhood of man which is above race, nationality, colour or language. So long as this so-called democracy, this accursed nationalism and this degraded imperialism, are not shattered, so long as men do not demonstrate by their actions that they believe that the whole world is the family of God... they will never be able to lead a happy and contented life, and the beautiful ideals of liberty, equality and fraternity will never materialise.

Before I close, may I urge one purely literary consideration? Universal poetry--like any other poetry--has its own variations of technique and attitude. Thus, there are poets of graphic vision, like Homer and Shakespeare, and there are poets of conceptual

1. Message broadcast from All India Radio, Lahore.

is hard, indeed, to forgive a poet who has actually fought us in the battle-field. That is where remittances in time becomes a catalytic agent stimulative of appreciation. But neither the original political aversion, nor the remoteness conducive to appreciation, should be reckoned to have any intrinsic value in terms of literary judgment.

On political issues generally, in so far as Iqbal was concerned with them, a basic fact must needs be stated here. In his poetry, it was not a parochial approach that Iqbal brought to bear on the politics of his day. His interests were world-wide, and not restricted to Asian countries alone. The well-known verse--

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینیا کی لاش

The vultures of Europe are not yet aware
How poisonous is the corpse of Abyssinia.

takes us beyond Islam and Asia. But with all his championing of the East, Iqbal was not hostile to the West. He attached, not Western man but a certain way of life which he considered vicious. Thus, in his sharpest satirical sallies, he was not anti-European, he was essentially pro-human. Some of his utterances on Western civilization are, no doubt, threats, but most of them are warnings:

از من اے بادِ صبا گوے بہ دانائے فرنگ،
عقل تا بال کشود است گرفتار تر است!

Bear this from me. O breeze. to the sage of Europe:
Reason is the more enmeshed as it spreads its wings.

issue is the second relevant fact that we would emphasize here. To Iqbal religion is not a matter of priest-craft or church government; it is vital impulse which has an essential contribution to make to the spiritual, and even physical, survival of mankind. In the present context it may be pertinent to quote a longer passage from the The Reconstruction"

> Both nationalism and atheistic socialism, at least in the present state of human adjustments, must draw upon the psychological forces of hate, suspicion, and resentment which tend to impoverish the soul of man and close up his hidden sources of spiritual energy. Neither the technique of medieval mysticism nor nationalism nor atheistic socialism can cure the ills of a despairing humanity. Surely the present moment is one of great crisis in the history of modern culture. The modern world stands in need of biological renewal. And religion, which in its higher manifestations is neither dogma, nor priesthood, nor ritual, can alone ethically prepare the modern man for the burden of the great responsibility which the advancement of modern science necessarily involves, and restore to him that attitude of faith which make him capable of winning a personality here and retaining it hereafter. It is only by rising to a fresh vision of his origin and future, his whence and whither, that man will eventually triumph over a society motivated by an inhuman competition, and a civilization which has lost spiritual unity by its inner conflict of religious and political values.

The entire argument so far has dealt, more or less, with the religious outlook in Iqbal's poetry. In politics, too, Iqbal was active both as man and poet. His personal political activity has, not unexpectedly, cost him a good deal of popularity with the less discerning (or the more bigoted) among his readers. Its

bered that Iqbal uses his Islamic terms indifferently for Muslim and non-Muslim alike. Referring to the self-chosen death of the Hindu mystic, Swami Ram Tirath, Iqbal freely makes use of the Kalmah of Islam, La Ilaha Il-Allah (There is no god but God).

نفیِ ہستی اک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
'لا' کے دریا میں نہاں موتی ہے 'الااللہ' کا

> Negation of Being is a feat of the knowing mind:
> In the ocean of La lies hidden the pearl of Il-Allah.

Thus, in Iqbal, the poet (i.e., the machinery of expression) is Muslim, but the poetry (i.e, the expressed meaning) is cosmopolitan. This is possible because of Iqbal's view of what he himself class 'the universal character of Islam." In The Reconstruction he quotes with approval Shah Wali Ullah's interpretation of revealed religion.

> The prophetic method of teaching, according to Shah Wali Ullah, is that, generally speaking, the law revealed by a prophet takes especial notice of the habits, ways, and peculiarities of the people to whom he is specifically sent. The prophet who aims at all-embracing principles, however, can neither. reveal different principles for different peoples, nor leaves them to work out their own rules of conduct. His method is to train one particular people, and to use them as a nucleus for the building up of a universal Shariat.

It is Iqbal's view of Islam, not that of his critic, that has significance in a just appraisal of Iqbal's poetry. We have already considered the fact that Iqbal invariably links Islam with universal issues. That he regards Islam itself as a universal

devotion to the level of the universal. Here is a quotation from Armughan-i-Hijaz.

به پایاں چوں رسد ایں عالمِ پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضورِ خواجہ ما را
حسابِ من ز چشمِ او نہاں گیر

When this age-weary world comes to its end.
And hidden dispensations are unveiled.
Save me disgrace in the presence of the Master;
O God, check not my record in his eye!

Here we have a specific reference to the Prophet, and the lines have an Islamic application in the narrowest sense of that word. Yet the human note in this supplication to God, the burning sense of having fallen short of a high ideal, the immeasurable love for the Master whose good opinion had been so much worth the striving for, might be readily transferred to the relations between any disciple and any master. These, and similar, verses should present no difficulty to a reader of Iqbal unless, of course, such a reader nourishes a private hostility towards the Prophet, and personal malice warps his aesthetic capacity. The point at issue is whether acceptance of the credo of Islam is essential--- or even antecedent --- to the appreciation of Iqbal. This has already been shown not to be the case. The core of Iqbal's message is human, not doctrinal.

بر خیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد !

Arise, the hour is come for man to reveal himself!

You may or may not be a Muslim to open your heart to such a message. And it should furthermore be remem-

consider the great Italian poet Dante. In Dante almost any page proclaims the poet's Catholic Christianity. Canto after canto in his *magnum opus* is dogmatically, and almost fiercely, assertive of 'the poet's own creed. Local politics and religious animosities are inserted, so that not only are the Prophet of Islam and Hazrat Ali housed in the Inferno (Canto XXVIII)--which might have been expected of a Christian poet, but Dante's own contemporaries, Popes Boniface VIII, Nicholas III and Clement V, are shown roasting in hellfire (Canto XIX). A considerable part of the *paradiso* concerns itself with the exposition of Christian dogma. Thus, Canto XXVIII is devoted to a vision of Christ triumphing with his Church. In the next canto St. Peter examines Dante on the articles of the true faith, and in the one that follows, we learn that Christ and the Virgin alone had come with their bodies into heaven. All this, and much besides, is forgiven Dante--for Dante is a "universal" poet. Going back to pagan times Lucretius, with his fervid exposition of an exploded philosophy, and with his out-of-date reverence for a Master whom nobody recognizes today, is admitted to the halls of immortality. What the 'liberal' critic of today cannot digest is allegiance to Islam and its Prophet. Is this because Islam still lives, and is likely to have a future? Let such a critic get rid of his political and religious complexes before he presumes to pass judgment on the issue of the universal in poetry. Otherwise, in judging Iqbal, he would only be inviting a judgment on himself.

That a poet of Iqbal's intense religious sensibility should at no point appear to bear the impress of the outlook of Islam is an incredible proposition. What is most surprising, however, and must be regarded as a miracle of creative art, is how often, for all men having profound faith in any creed whatsoever, Iqbal's sincerity and fervour can raise a particular

This is a unique philosophy of life and universal being. But it is not unique because it pitches the consciousness of man against the immensity of space and time. Kant had already done that, and so had Fichte and others. With Kant and the rest, however, the theory of the self of man remains only an intellectually comprehended fact. To Iqbal the knowledge comes red-hot in a glow of feeling by virtue of its actual human implications. And it is exactly because its emotional illumination as an apocalypse that it became a theme worthy of great poetry. This was where the poet rose from the particular to the universal. He saw his people fallen on evil days, saw that the whole issue lay between a psychology of life and a psychology of death. Thus from the mind of his own people he passed to the mind of man, and from the mind of man to the very heart of life and the moving principle of the universe. This stupendous vision of man and earth and star opens an infinity of moral and spiritual possibilities, links together Past, Present and Future, and bridges the gulf between the human and the divine. Thus does the throb in the heart of Asian man become one with the music of the spheres. This is political, and therefore human, poetry of an order the like of which has never been written before. Never has nationalism thus overflowed to the uttermost reaches of a world-view in which the earth becomes a mere parish of the infinite.

With this achievement of the poet as background a critic who would accuse Iqbal of narrow religiosity is himself liable to become an interesting study. Admittedly the greater part of Iqbal's significant terminology and imagery is borrowed from Islam. This is as it should be, and no sound criticism should expect a profoundly religious mind to write poetry with no personal religion in it. Should a poet cut himself off from his own spiritual tradition before he qualifies for universality? The practice of some of the greatest poets of the west negates grotesque demand. Let us

in Asrar-i-Khudi opens with a memorable passage in which the Self comes out as a cosmic creative force working its purposes through, and beyond, space and time:

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہان پوشیدہ اندر ذاتِ او
غیرِ او پیداست از اثباتِ او
در جہان تخمِ خصومت کاشت است
خویشتن را غیر خود پنداشت است
سازد از خود پیکرِ اغیار را
تا فزاید لذتِ پیکار را
می کشد از قوتِ بازوئے خویش
تا شود آگاہ از نیروئے خویش
خود فریبی ہائے او عینِ حیات
ہمچو گل از خوں وضو عینِ حیات

The form of existence is an effect of the Self,
Whatsoever thou seats is a secret of the Self.
When the Self awoke to consciousness.
It revealed the universe of Thought.
A hundred worlds are hidden in its essence.
Self-affirmation brings Not-self to light.
By the self the seed of hostility is sown in the world.
It imagines itself to be other than itself.
It makes from itself the forms of others.
In order to multiply the pleasure of strife.
It is slaying by the strength of its arm
That it may become conscious of its own strength.
Its self-deceptions are the essence of Life;
Like the rose, it lives by bathing itself in blood![1] '

1. Tr. R.A. Nicholson.

In other parts of his work the anguish of his heart comes out in such supplications as this--

برسرِ کفر و دیں فشاں رحمتِ عام خویش را

On Faith and un-Faith shed alike Thy universal bounty!

The general ruin of religious values comes to him with a painful shock:

در کلیسا ابنِ مریمِ را بہ دار آویختند !
مصطفٰی از کعبہ ہجرت کردہ با اُم الکتاب !

In the Church they hung up Mary's Son on the Cross!
From the Kaba Mohammad migrated, carrying the Mother of Books!

It is not for the sorrows of a sect, or the sufferings of a parish, that his mighty heart is bursting:

دل گیتی ! انا المسموم ، انا المسموم فریادش
خرد نالاں کہ ما عندی بتریاق لاوراق کذا

O the heart of the world! it cries "I am poisoned. I am poisoned"

And Reason moans: "No antidote, nor talisman have I!

The modern world has become a scene of decay and death. So much the more does Iqbal cherish the spark of enternity in the heart of individual man. The finest part of his work centres round the kindling of that part into a mighty blaze. From the nascent self of man Iqbal would bring a thousand fires to "Synagogue and Mosque and Temple and Church". They argument

In the ultimate analysis, Iqbal's most compelling concern is the future of man; not the future of a religious creed. The greater part of Armughan-i-Hijaz his last and posthumously-published work, falls into three sections. From the presence of God, Iqbal passes into the presence of the prophet, but the final section is addressed to the World of Man. The earlier sections, however, are not purely devotional--in the orthodox sense of the word. In "The Presence of God", it is not a personal redemption that the poet seeks. All the fervour of his profound sense of religion is concentrated in the prayers--

ز خاکِ ما دگر آدم بر انگیز

Raise from our dust a second Adam!

Again and again he pleads passionately with God-not for the physical survival of his own people, but for the moral survival of mankind as a whole. For it is an ideal that he worships: he has no idolatrous regard for race or creed or place. Referring specifically to the Muslim nations of the world, he cries:

بیا نقشِ دگر ملت بریزم
کہ ایں ملت جہاں را بارِ دوش است

They are a dead weight to the world:
Come, let us fashion a new people.

And Again:

دلم نکشود ازاں طوفاں کہ دادی
مرا شورے ز طوفانِ دگر دہ

My spirit did not swell to the storm Thou gavest,
Give me the glory of another storm!

trate this with one more quotation. in Iqbal's own beautiful English translation. It is a longer, passage this time from Javed Namah. The "Stations" of a Sufi's mystic pilgrimage are recalled, and the Ascension of the Prophet; but behind it all looms the image of the destiny of man:

Art thou in the stage of "life", 'death'or death-in-life'?
Invoke the aid of three witnesses to verify thy 'Station'.
The first witness is thine own consciousness--
See thyself, then, with thine own light.
The second witness is the consciousness of another ego--
See thyself, then, with the light of an ego other than thee.
The third witness is God's consciousness--
See thyself, then, with God's light.
If thou standest unshaken in front of this light.
Consider thyself as living and eternal as He!
That man alone is real who dares--
Dares to see God face to face!
What is 'Ascension'? Only a search for a witness
Who may finally confirm thy reality---
A witness whose confirmation alone makes thee eternal
No one can stand unshaken in His Presence;
And he who can, verily, he is pure gold.
Art thou a mere particle of dust?
Tighten the knot of thy ego;
And hold fast to thy tiny being!
How glorious to burnish one's ego
And to test its lustre in the presence of the Sun!
Re-chisel, then, thine ancient frame;
And build up a new being
Such being is real being
Or else thy ego is a mere ring of smoke!

ethics no less electrified with the shock of a personal revelation.

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم
بہ ز دیں دارے کہ خفت اندر حرم

The wakeful heathen prone before an idol
Is better than a man of faith asleep in the
House of God.

گر از دستِ تو کارِ نادر آید
گناہے ہم اگر باشد ثواب است

If thou achievest something rare,
Even though a sin---it is an act of virtue.

This titanic vision of life unconfined is put naturally into words and images borrowed from the poet's own society. This was a society to which the land-mark of the history of Islam and the phraseology of the Quran, with its major doctrinal concepts, were the main vehicles of education. The great teacher could only use the language of his people. In the following verse, for instance, Iraq, the Hijaz, Kufa and Syria, are mere symbols of an earth pledged to death and dishonour, looking for a greater man to come and redeem it:

ریگ عراق منتظر، کشتِ حجاز تشنہ کام
خونِ حسینؓ باز دہ کوفہ و شامِ خویش را!

The sands of Iraq lie waiting; the fields of Hijaz are athirst
O give the blood of Hussain to the Kufa and Syria again!

The infinite greatness of man in a boundless universe is represented again and again in phrases relative to a Muslim's life. I would illus-

poetry parochial. Poetry of the sort written by George Herbert or Richard Crashaw, and the usual hand and Na't of Muslim poets, are essentially communal in their appeal. In so far as religious dogma is a condification of facts outside the mind of the poet, it is not susceptible of poetic treatment. But the highest poetical results may be achieved when the inner spiritual urges of the poet find vent in the social and moral framework set up by a religion. Dante's Christian poetry and Iqbal's Islamic poetry are of this high order. The sources of Iqbal's inspiration lie within the spirit, not in an external dogma. Never is Iqbal's poetry a mere echo of orthodox belief. His sublime vision of God's immanent purpose in Man, of God striving to realise Himself in Man, of Man emerging from his mortal interlude in the full glory of immortal life, may even appear to be a little heterodox:

کشای چشم کہ آں کس کہ لن ترانی گفت
ہنوز منتظر جلوۂ کفِ خاک است

Open your eye, for He who said, "Thou wilt not see me"

Awaits to see a speck of dust revealed.

And again:

چناں بزی کہ اگر مرگِ ماست مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسارتر گردد

So live that if our death be death eternal,
God should the more repent His own Decree:

With this unorthodox metaphysics Iqbal links an

sal Poet? translated into English, this observation runs as follows: Any theorist who thinks sincerely in terms of humanity as a whole... must turn to the socialist system...What is the reason, then (for Iqbal) to have preferred Islam to Socialism?[1]This is a strange question to ask, but we are concerned with its literary aspect alone. We would, therefore, say that Iqbal preferred Islam to Communism because his deepest feelings were integrated with Islam, not with Communism. All are-from the lowest to the highest---is so largely a matter of emotive response that an artist will disavow , his genuine emotional affiliations only at the risk of thwarting the creative process. In the happy fusion of cosmic emotion with particular facts of experience lies the supreme, greatness of Lucretius, Dante and Goethe of Rume, Sadi and Iqbal.

Moreover, there is no inherent discord between religion and the highest art. Rather the contrary. Marxist and other modern critics, who are inclined to believe that religion narrows down the scope of art, will do well to note that most of the greatest monuments in poetry and music, in sculpture and architecture, have been inspired by religion. Religion, like love, has been from time immemorial the premium mobile in the universe of poetry. It is obvious, however, that love has life and being only when it is directed to the particular. So also may the poets consecration to a particular creed exalt the spirit and raise it to a vision of immortal truth. For religion, no less that love, thrives on a particular loyalty, nor has it ever breathed in the supposedly universal atmosphere of a vacuum. Thus, it is always a circumscribed loyalty which, in the highest sphere of expression, gives meaning and vital purpose to love and religion.

Of course, it is quite possible to take a narrow view of love or religion. But this limited view may always be recognized and judged by objective standards. Only when it is rooted in dogma is religious

peremptorily present to his mind. The theme is not incidental in Iqbal; it lies at the very root of his thought and comes out by inference when he is not expressly referring to it. Thus, talking of the principle of movement in the structure of Islam, he observes in chapter VI of The Reconstruction of Religious Thought in Islam (pp.158-59)

> Islam is non-territorial in its character, and its aim is to furnish a model for the final combination of humanity by drawing its adherents from a variety of mutually repellent races, and then transforming this atomic aggregate into a people possessing a self-consciousness of their own.

An identical note of comprehensiveness inspires this remarkable passage from the same chapter of The Reconstruction (p.147):

> There is no such thing as a profane world. All this immensity of matter constitutes a scope for the immensity of spirit. All is holy ground.

And to this he adds the characteristic observation: "As the Prophet so beautifully put it: The whole of this earth is a mosque". Referring to some of the smaller institutions of Muslim society, Iqbal insists that we must "look at their structure, not from the standpoint of social advantage or disadvantage to this or that country, but from the point of view of the large purpose which is being gradually worked out in the life of mankind as a whole"(my italics).

The Marxist school of literary critism in Urdu finds fault with Iqbal's sense of the universal , because the poet used Islam, rather than Marxism, for the exposition of his moral and social idealism. A contemporary exponent of this school makes a typical observation, in an essay entitled "Is Iqbal a Univer-

Better than the whole world is Hindustan of ours!
This vision was more broad-based than when he said later.

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

China is ours And Arabia, and Hindustan is ours:
Muslims we are: our homeland is the entire world

It is hard to understand how this later and sublimer phase can be described as parochial, while the common run of insular patriotic poetry should pass muster as universal. Territorial nationalism is the legacy of Greece, and it would appear that this particular form of political parochialism has had its day. The modern world is already looking forward to an international outlook, and the loyalties of race and place are making room for ideological loyalties. Historically, Islam was the first considerable movement to bring this modern note to bear on the organization of world forces, and naturally enough. Iqbal's sense of the philosophy of history went straight to this point when he discovered the inadequacy of local or regional patriotism. Some people frown at any mention of "Islam" and "Muslim" in poetry. But it is, of course, obvious that, poetically as well as rationally, there is nothing against invoking a larger vision of man from a historical and philosophical fact. Iqbal has himself elucidated this point in his famous latter to Dr. R.A. Nicholson, wherein he analyses and refutes some of the critism made by Mr. Dickinson who objected to Iqbal specifically addressing himself to the Muslim world.

It is well to remember that in Iqbal's references to Islam the largest issues of the human family are

a fine instance of how the particular merges into the universal. Here is a family scene enacted in Troy three thousand years ago, and yet it belongs to the whole earth and to all human beings today and tomorrow. It has vitality because it was so vividly particularized. Let us not forget, moreover, that Homer, with all his greatness, belongs primarily to his own age and to Greece--just as Shakespeare is rooted in that very much circumscribed bit of earth--"This other Eden, demi-Paradise". Homer's grip on the life of his day is at once real and practical. The ideals of a bygone Heroic Age are the inspiration behind the framework of his story and character, which are both focussed on the obsolete Greek pantheon. Viewed that way, it is surprising how much of the Iliad and the Odyssey is steeped in the myth and ritual, the superstition and tradition, of the Greek world. Homer's Hellenism and humanity both make an essential contribution to his universal appear. Here, as elsewhere, the particular gives life to poetry, while the universal bequeaths to it its immortality. But a poet must live first before he may hope to be immortal.

Now when Iqbal is impugned as being a "Parochial" poet, the critic obviously holds that Iqbal's lively concern with the local and the contemporary is barren of consequential human worth. This would signify that while other great poets survived the initial contact with the particular. Iqbal failed to convert ephemeral dross into immortal gold, and is, therefore, in the final reckoning, adjudged to be one who lacked interest in man and in the world at large. This unfavourable judgment usually proceeds on the assumption that the early Iqbal who wrote "Naya Shivala" and "Tarana-i-Hindi" was shaping well towards a universal outlook when something went wrong, and he choose to turn to a narrower view inspired by religion. Thus, when the poet sang--

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا !

philosophy, content itself with form and idea alone. The philosopher and the mathematician formulate their concepts in universal terms. That is not how the poet--even the poet of universal scope--expresses himself. More often than not he begins and apparently ends, with a particular experience. Poetry enunciated in universal formulas is hardly conceivable. From a particular inspiration the poet rises to an expression, not of the universal but, ostensible, of another category of the particular. The universal note in poetry comes by implication and suggestion and, as it would seem, in spite of the particular.

For all its universal quality, the ghazal of Hafiz is a record of particular experience. Shakespeare's universality could not find vent except in particular situations and through the acts of particular persons. Great poetry is located somewhere midway between the universal and the particular. Thus, it is Beatrice--one particular woman, and Christianity--one particular religion--that inspire the flight of Dante's imagination beyond space and time. What keeps poetry alive is its capacity to be interpreted in terms of I and now of the reader. The capacity to be so interpreted depends mainly on the scope given to the reader to pass beyond the social and moral particularisms of the poet.

There is in Homer the great scene in which Hector comes to bid farewell to Andromache, who weeps and would stop her husband from going to his death. "Surely", says Hector, "I take thought for all these things, my wife; but I think shame because of the Trojans and the Trojan women of the long robe, if I shrink like a coward from the battle". And then that peculiar touch: Hector's child in the nurse's arms, crying in fear of his father in coat of bronze and helmet. "Then his dear father laughed aloud, and his lady mother; and Hector laid his helmet on the ground, and took his son in his arms and kissed him". This is

among the great poets, for his doctrines are essentially concerned with the probable scope of human nature--with the emerging, divinity of man--rather than with the fortunes of a particular group of persons. Iqbal's art is focused, not on the history of Islam, but on the apotheosis of the human ego, a force which must unfold itself in the future.

The issue between the universal and the parochial in poetry has never been reduced to the precision of a mathematical formula. On this, as on all questions of ultimate value, there always will be ground for argument. Certain relevant facts remain to us, however, and they may be stated on the clear-cut pattern of a geometric theorem. Thus, the issue of a universal (or other) note in poetry is never raised except in the context of inherent greatness. That is to say, good poetry (which may, or may not, be great poetry) does not in-itself provide matter for our argument. It is only with the greatness of poetry that the question of universality, or the reverse, is involved. Henry Vaughan and "rare Ben Jonson", for instance are not subject to the dispute but Milton and Shakespeare are. Similarly we apportion praise or blame to Ghalib and Iqbal with reference to the width of their appeal, but never on that score judge even supremely good poets like Mir Taqi or Khawaja Hali. It is poetry of a certain magnitude that raises the issue not any other. Exquisiteness, working on the smaller canvas of a Sappho, is left alone; but such greatness as Dante's if it turn away from the larger canvas, must come in for criticism.

Apart from the fact that we always concede an initial greatness to the poet whom we would commend or disparage on account of scope and amplitude, there is another consideration no less fundamental. It concerns the process of creation, in which you cannot but state the particular even though you mean the general. Poetry is a matter of flesh and blood; it will not, like

PROFESSOR HAMID AHMED KHAN

THE UNIVERSAL NOTE IN IQBAL'S POETRY

Iqbal continues to be such a dynamic influence in the contemporary affairs of mankind that part of the modern world is still interested in denying him. Could he today speak for himself, he would not ask for a higher tribute. Even while he lived, voices were raised in protest against his intense preoccupation with his own times and his own people. Thus Dr. Nicholson of England--with all his admiration for the poet--made an indirect criticism when he observed: "His message is not for the Mohammadans of India alone, but for Moslems everywhere". Later, Professor Poure Daoud of Iran dubbed Iqbal "only a local poet". Still later, Mr. Iqbal Singh of India in his publication. *The ardent Pilgrim*--added to the mass of this particular criticism of Iqbal. Mr. Iqbal Singh alleges that Iqbal's poetry (or most of it) can be interpreted only "as being applicable to the development of a particular class and group", and he proceeds to single out some of the important poems which are "essentially parochial in their inspiration".

How should we distinguish between what is merely local and what is universal in poetry? As in the case of many other problems,Aristotle shows the way by making a distinction between "such things as have actually happened" and "such as might have happened--such as are possible, according either to probable or necessary consequence". "On this account", Aristotle goes on to say, "poetry is a more philosophical and a more excellent thing than history: for poetry is chiefly conversant about general truth, history about particular". It is in this sense according to Aristotle, that Herodotus deals with the particular ("what has been") and Homer with the universal ("what might be"). If we proceeded to pass judgment in terms of the Aristotelian point of view, Iqbal certainly would be

this world, all changes and all forms of progress and development. All sequencies of time, have been recorded by Allah in LOH-E-MAHFOOZ. Iqbal overlooks this fact. He starts with the postulate that time is not a static absolute or a straight line but a living creative movement. In stressing the importance of struggle, he states that the future is an open possibility. Islam also regards the future as an open possibility but states that God comprehends the future and that the working of the universe follows *divine will* and *divine law* rather than erratic courses dictated by exigency or changing sets of circumstance. With apology to those who sanctify Iqbal, I would submit that he is concerned less with the interpretation of Islam than with the construction of a theory representing life as a continuous movement in time.

Faran.
December 1977.

the movement of the first time and another which times the second time, and so on to infinity."

However, Iqbal's description of Zarwan* is in consonance with Einstein's view that space-time is relative to the observer. Welcoming Einstein's theory, he states:

"It destroys not the objectivity of nature but the view of substance as simple location in space view which led to materialism in classical physics. Substance for modern Relativity Physics is not a persistent thing with variable states buy a system of inter-related events. The concept of matter has received the greatest blow from the hand of Einstein whose discoveries have laid the foundation of a far-reaching revolution in the entire domain of human thought."

But Iqbal misunderstands the theory of relativity in so far as he regards time as the fourth dimension of space and arrives at the conclusion that in that case the future would be fixed and time would not be free creative movement. As a matter of fact, according to theory of relativity, time is a dimension of Space-Time continuum and nature is a structure of events characterised by a continuous creative flow.

Iqbal differentiates between serial time (time of the efficient ego) and durational time (time of the deeper ego) and states that NOW of durational time equals MILLENNIA of serial and successional time. He regards ultimate reality as pure duration compounded of life, thought, purpose and time. Evidently this thought is not derived from Islam. The same is true of his view that the universe is not the temporal working out a pre-conceived plan. Of course the ideal of a growing universe is attractive to a philosopher but this growth is not automatic, anarchic or self-evolutionary. God is Omniscient and all that will happen in

*Spirit of space-time in Javed Namah.

Iqbal regards the universe not as a wound up mechanism but as a conscious force. He believes that each atom burns to reveal itself and each particle yearns to be a god and asks us to plunge into the sea and ride destiny to win immortality instead of consorting with fiends on the shore. He regards life as perennially quivering and continually young. He wars against fatalism and defines fate as "time regarded as prior to the disclosure of its possibilities". or "time disengaged from causal sequence". He asks Muslims to develop their potentialities and achieve self-fulfillment.*

Iqbal believes that time depends on psychic life. He does not regard time and space to be independent categories. He believes that point is inseparable from the instant, though the instant is more fundamental, that time is the spirit of space. He rejects the theory of atomic time on account of its stress on a succession of "nows". But he also rejects the modern theory of numbers and sets of points on account of its stress on infinite divisibility of time. He believes in a simple continuity of time".** He also rejects the modern quantum theory on account of its stress on the objectivity of time. He states:

"If flow movement or passage is the last word as to the nature of time there must be another time to time

---

* اے اسیرِ دوش و فردا در نگر
اندرونِ خود عالمِ دیگر نگر
در گِلِ خود تخم ظلمت کاشتی
وقت را مثلِ خطے پنداشتی
ایں و آں پیداست از رفتارِ وقت
زندگی سریست از اسرارِ وقت

** تیرے شب و روز کی حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

themselves in flames, to change their condition, to conquer their environment, to give up moral inertia, to remould history and accept the challenge of time by stepping into the theatre of life and creative activity, to define and fortify their personality and engage in untiring action as is done by the drop to get metamorphosed into a pearl or the candle to remain aglow, to eschew servitude and stagnation sanctioned by romantics and reactionaries, to cultivate faith in themselves and their future, to outgrow time, space and causality, to experience an urge to live.

Iqbal's theory of ego has attracted notice the world over. He regards God as Ultimate Ego and the universe as a continuous act of God, the degree of egohood differentiating mind from matter and thought from atom. He regards man as a free and unique personality capable of becoming a co-worker with God. He looks upon man as a spiritual being realising himself in space and time. His is a philosophy of perpetual quest: the universe is not a completed act, man shares the process of creation, life is an assimilative process. The dynamism of his thought is illustrated by his postulate that life is a perpetual motion*. He regards the universe as a creative force rationally directed, as an act rather than an immutable object. There is reminiscence of Bergon's elan vital which gropes to conquer its freedom from inertia. His conception of Mard-e-Momin is reminiscent of Nietzche's superman, though there are obvious differences because Nietzsche glorifies ruthless physical and mental force while Iqbal glorifies self-purification and self-ennoblement.

---

* فریب نظر ہے سکون و ثبات

موج ز خود رفتۂ تیز خرامیدہ گفت

ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

Re-chisel then thine ancient frame,
And build a new being;
Such being is real;
Or else thy ego is a mere ring of smoke.*

He tells Muslims that their creative powers can germinate another world:-

Beyond the stars, there are yet other worlds
There are unnumbered caravans on the march!

He lays stress on self-realisation and declares that struggle energizes nations and leads to new modes of thought and action and radical break with convention.** He asks men to be completely themselves, to kindle the fire hidden in their dust, to rise with an ideal, to change themselves and the world, to wrap

---

خود جہانِ خویش را تقدیر باش *

کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشادہ شرق و غرب
عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لیے
لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے
جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آب جو سے کیے بحر بیکراں پیدا

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی **
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود

III

Iqbal is stung by the debasement and stupor of Muslims on account of their drafts away from Islam* and is compelled to credit Satan with independence of mind, intense love of life and passion for cation, making him claim at this fire "makes blood course through he veins of creation". Conscious of the eternal unity behind the phenomenal world and endowed with a cosmic vision, Iqbal assumes the role of a resolutionary. He declares:

Old are the stars and old is the sky,
I want a world newly born!

He wants moonbeams to trickle into the dark night of his thought so that he could lead the wanderer home and fill the idle onlooker with restless impatience. conscious of his high mission to rouse Muslims from their torpor, he declares:

My being grew and reached the sky
The Pleiades sank to rest under the skirts of my garment.

He reminds Muslims of their infinite possibilities and asks then to explore new horizons and strive for emergence as a glorious force instead of remaining inert. He tells them that their destiny lies beyond the azure firmament and that theirs is the caravan with stardust flung in its wake, that their destination is far beyond Europe:

---

* غافل ترے ز مردِ مسلماں ندیدہ ام
دل درمیانِ سینہ و بے گانۂ دل است

The day of the sovereignty of the masses draweth near!
Destroy the relics of olden times wherever you find them
Set fire to every ear of corn in the field
Which faileth to provide a livelihood for the peasant!

Iqbal justifies the modern state as the means to the end of Pan-Islamism. Pan-Islamism and not Pakistan is the fulfillment of Iqbal's dream. This thought too is based on his practical approach. He was agonised by the poignant contrast between the woeful decadence of Muslims and their past glory and resplendent heritage of Cordova and Granada. He was disillusioned by the gradual dis-integration of Ottoman empire, the wretched plight of Muslims in Russia, China, Eastern Europe, Middle East and post 1857 India. Under the influence of Jamal-ud-Din Afghani he visualises Muslim Renaissance and Pan-Islamism and asserts that in spite of mutiplicity of Islamic States, it is possible to have a unified Muslim community just as there are two eyes but one eyesight. He states that Muslims may belong to sundry parts of the globe yet they are the dew of one smiling dawn*. But his view that the state is the means to Islamic solidarity has been interpreted by some scholars as reminiscent of the Communist view that the state is the means to equalitarianism.

---

* ما کہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم
چون نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما
شبنمِ یک صبحِ خندانیم ما

ception of the Muslim state is based on the Western conception of the state. He states that every Muslim nation must sink into her deeper self, temporarily focus her vision on herself alone, until all are strong and powerful to form a living family of republics; and true unity is manifested in a multiplicity of free independent units whose racial revalries are adjusted and harmonised by common spiritual aspiration.

Iqbal accepts the Western concept of the state but he integrates it with Islam. He repudiates the Christian dichotomy between religion and politics, the Pope and Caesar, the spiritual and temporal. He declares:

"It is the invisible mental background of the act which ultimately determines its character. An act is temporal or profane if it is done in a spirit of detachment from the infinite complexity of life behind it; it is spiritual if it is inspired by that complexity."

He does not divorce religion from politics* and declares that human interests are more important than national, that the Islamic concept of the universal brotherhood of man is infinitely superior to political philosophies giving rise to mutually ill-adjusted states and racialism and social inequity. He cries out:

Arise and awake the poor of my world,
Shake the doors and walls of the mansions of the rich,
Kindle the blood of slaves with the fire of faith,
Give the humble sparrow the strength to fight the falcon!

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو *
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

Moon, Mercury. Venus, Mars, Jupiter, Saturn and Paradise and discusses capitalism and communism and proposes a synthesis of Eastern and Western culture, a syntnesis of heart and the intellect. Iqbal's political thought should not be interpreted merely as a social manifestation of his faith. Dr. Javed Iqbal cautions us against such a simplicistic interpretation:

"The crux of Iqbal's teaching is his vision of the Muslim society of the future, a society devoted to the full development of individuals in their capacity as co-workers with God. He was, therefore, the first Muslim in the Indian sub-continent to express a coherent demand for the establishment of Islamic socialism. A genuine response to Iqbal would be the development of economic and other structures through which the realisation of his vision would be facilitated."

We know that Iqbal exhorts Muslims to imbibe new knowledge. He writes:

"In our observation of nature we are virtually seeking a kind of intimacy with the Absolute Ego and this is only another form of worship."

In the beginning he accepted nationalism* though militant Hinduism obliged him to reformulate his thought and declare that nationalism was a form of idolatry because Islam countenances supernational rather than national sovereignty. But though Islam, rejects the dualism implicit in the nationalist theory of state and though in Islam the state is an ideological rather than a territorial entity, Iqbal regards the establishment of legislative assemblies in Islamic countries as a great step in time. Evidently his con-

---

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا *

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

studied his own religion.* But we should, in all fairness, remember that he imbibed Islamic and Western culture through Maulvi Mir Hasan and Thomas Arnold, and as a student at London and Cambridge, Hiedelberg and Munich, shared the intellectual turmoil of Europe, and later on taught not only Arabic but also philosophy and English literature and had an inquisitive and complex mind. In his notebook :"Stray Reflections" he states that in his student days he was on the verge of atheism but he soon transcended this "phase of ignorance and folly." Qawwals of Pakistan have thrust Iqbal into a rarefied atmosphere from which it is not very easy to retrieve him. However, the fact cannot be ignored that he had his feet firmly planted on ground and that his thought cannot be interpreted in isolation from the socio-political conditions of his time. His thought has influenced the course of history in Asia through the establishment of Pakistan in 1947. We know that in 1940, Quaid-e-Azam declared in unequivocal terms that if he lived to see the ideal of a Muslim state being achieved and if he were then offered to make a choice between the works of Iqbal and the leadership of the Pakistan state, he would prefer the former. And we know that it was Iqbal who in his presidential address to the annual session of All India Muslim League spelt out the blueprint for Pakistan so that Indian Muslims could fulfill their higher destiny in the context of 20th c. And his dream of Pakistan was not the random emanation of a heated imagination. Grievously pained by the economic and cultural subjugation of Indian Muslims, he urged them to demand territorial specification declaring that nations are born in the hearts of poets but prosper and die in the hand of politicians. In Javed Namah, he visits the

---

* خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

will constitute a formidable force of righteousness. He believes that unqualified devotion to God and the Holy Prophet releases inexhaustible energy that transforms us and the world. He makes a moving reference to Hazrat Bilal and states that he excelled Alexander in moral excellence. *

Iqbal believes that only Islam can produce a revolution in modern society and create. "a new world where the social rank of man is not determined by his caste or colour or the amount of dividend he earns but the kind of life he lives, where the poor tax the rich, where human society is founded notion the equality of stomachs but on the equality of spirits."

II

Iqbal has been called the noblest voice of Islam in the twentieth century. But, as his son Dr. Javed Iqbal cautions, we should not volatilize him or appropriate him to our pre-conceptions. No doubt he regards European civilization as a gilded but empty scabbard and declares that he has not been dezzled by the splendour of Western wisdom because he has thoroughly

---

* توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
ہے تازہ آج تک وہ نوائے جگر گداز
صدیوں سے سن رہا ہے جسے گوشِ چرخ پیر
اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے
رُومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے
ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست
تا عصائے لا الٰہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست
در قبائے خسروی درویش زی
دیدہ بیدار و حق اندیش زی
قربِ حق از ہر عمل مقصود دار
تا ز تو گردد جلالش آشکار

reflecting, surveying the past, the present and dynamically imagining the future, he is sure to be convinced of the inadequacy of his mechanical concepts. We must not forget that what is called Science is not a single systematic view of reality -- it is a mass of sectional view of reality -- fragments of total experience, which do not seem to fit together. Religion which demands the whole of reality and for this reason occupies a central place in any synthesis of all the data of human experience has no reason to be afraid of any sectional views of reality."

Iqbal believes that Islam affords a direct vision of reality, invokes responses from the depth of our being and enables us to transform the world through the combined might of power and vision, qahiri and dilbari, affords a vision of the non-ṭemporal, awakens in us relationship with immutable laws of nature. He is grieved by the drift of Muslims from their religio-cultural tradition and reminds them that by subordinating their will to the will of God, they will attain supreme power, find meaning in their existence and achieve self-fulfillment of the highest order*. Looking upon Islam as a life-giving instrument of reorientation and redemption, he asks, Muslims to immerse themselves in the light of God, to draw as near Him as possible. He assures them that as long as they have unqualified belief in the oneness of God and comprehensive perfection of Islam they will hold sway and

---

* جلا سکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں
تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا ہے گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

looks upon Islam as a cultural force which rejects the static view of the universe, displaces blood relationship as a basis of unification, recognises the worth of the individual, emancipates man from superstition, tyranny and shibboleths by declaring that human life is spiritual in origin, reshapes the intellect, schools the emotions, demands loyalty to Allah rather than temporal rules, unfolds highest water mark of human destiny and harmonious progress by making Allah the focus of reference for all value judgments, or in the words of Whitehead "the tangible fact at the base of finite existence", stands for total regeneration of mankind, not merely at the economic plane but also at the moral, spiritual and intellectual planes. Iqbal believes that reality is fundamentally spiritual and that the universe is more like a great thought than a great machine. So he slates science and sensory experience for apprehending reality piecemeal. He slates materialism (a product of the human mind) for denying the reality of the human mind and depriving man of his significance in the context of total creation. He writes:

"To describe consciousness as an ephiphenomenon of the process of matter is to deny it as an independent activity and to deny it as an independent activity is to deny the validity of all knowledge which is only a systematized expression of consciousness. Consciousness is a variety of a purely spiritual principle of life which is not a substance but an organising principle, a specific mode of behaviour essentially different to the behaviour of an externally worked machine."

Reconstruction of Religious Thought in Islam

Iqbal maintains that mind is not material. He argues:

"If the biologist studies life as manifested in himself i.e. his own mind freely choosing, rejecting,

the spiritual evolution, of human society will be brought about through trial and error without recourse to the Holy Quran and the Sunnah. In his poetry, however, Iqbal moves away from this position and acknowledges the fact that the trust sources of our guidance are the Holy Quran and the Sunnah and not our own resources* Iqbal berates materialism and is against compromising one's personality for the sake of filthy lucre. He hates merely material gains for their coarsening effect on our moral fibre and compares wealth to a spark in contradistinction with the light of self-affirmation. He regards death to be infinitely better than such livelihood as would weaken our power of flight. He asks us not to relegate Islam to the past but regulate our lives according to its teachings so that new vistas of glory may open to us.** Iqbal

---

* آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
دین فطرت از نبی آموختیم
در رہِ حق مشعلے افروختیم
حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید
وز رسالت در تنِ ما جاں دمید
از رسالت در جہاں تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

** تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن
ای مسلماں مردن است ایں زیستن
خودی کو نہ دے سیم و زر کے عوض
نہیں شعلہ دیتے شرر کے عوض
خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

and transforms them into a people possessing a self consciousness of their own. *

Iqbal states that the finality of the prophethood of the Holy Prophet (peace be upon him) emancipates life from being for ever kept in leading strings and throws man back on his own resources for the achievement of full self-consciousness. But I am afraid this view smacks of the philosophical/scientific view that life is gradually evolving and the stage of full self-consciousness has yet to be reached. Some adherents of this school of thouaht aver, that Iqbal's Mard-e-Momin is the superman of tomorrow as adumbrated in science fiction. Islam, it may be remembered, does not wait for a golden age in the future, a Christian millenium or a socialist age of equalitarianism and plentitude. The finality of the prophethood of the Holy Prophet (may God's choicest blessings: be on him) denotes and consummation of he divine commandments, the flowering of religion in its highest form and the climax of human perfection. Iqbal's reference to the throwing back of man on his own resources is a fanciful and philosophical reconstruction which has no basis in Islam. Iqbal rightly identifies spiritual emancipation of the individual and basic principles of a universal import directing the evolution , of human society on a spiritual basis. But it is un-Islamic to think that

---

* حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساسِ کلمه تعمیر کرد
ملتِ ما را اساسِ دیگر است
این اساس اندر دلِ ما مضمر است
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست

like a foetus and consequently aware of every movement or even taking place in the theatre of human activity.

But apart from these philosophical excursions, Iqbal believes in Islam as an instrument of regeneration and redemption. He expresses dissatisfaction with Western civilisation and calls it a valley of darkness lacking the fountain of life. He distrusts its polished but fragile exterior and deplores its materialistic foundation. He dreams of a world governed by religion rather than politics. He dreams of a time when Islam will once again animate the intellectual and emotional life of mankind. He believes that Islam awakens man to a fresh vision of his origin and future, his when and whither, ensures the harmonious development of the individual and transforms humanity into an indivisible community because belief in the oneness of Allah leads to man's loyalty to his own ideal nature. He believes that Islam enables its followers to live radiantly to "kindle every atom of the universe", inculcates qualities that make a "Fakir" excel Darius and Alexander, puts an end to exploitation and injustice and is the panacea for all the ills of mankind and the source of temporal as well as spiritual glory, the complete/perfect code of life for all generations of mankind.* He states that far from countenancing geographical and racial barriers which restrict the social horizon. Islam has a non-terrestrial character, draws its adherents from a variety of mutually repellent races

---

گوہرِ دریائے قرآن سفتہ ام *
شرحِ رمزِ صبغة الله گفتہ ام
قوتِ سلطان و میر از لا الہ
ہیبتِ مردِ فقیر از لا الہ
دارم اندر سینہ نور لا الہ
در شراب من سرور لا الہ

Prof. IRSHAD-UL-HASAN

THE RECONSTRUCTION OF THOUGHT IN IQBAL

Iqbal is impatient with classical philosophy which suffers from abstract dualism between mind and matter and with modern philosophy which denies reality beyond matter. He is impatient with the barriers of senses and reason and wishes to achieve closer contact with reality through Islam. He regards God as a personal reality and not an impersonal force and states that the Supreme Ego is neither merely transcendent as understood by theists nor merely immanent as understood by pantheists. But in spite of this view , his use of words like Ultimate Reality and Creative Force suggests a primarily philosophical conception of God. He writes :

"The Ultimate Reality is a rationally directed force. To interpret this force as an ego is not to fashion God after the image of man. It is only to accept the simple fact of experience that life is not a formless substance but an organising principle of unity which holds together and focalises the dispersing disposition of the living organism for a constructive purpose."

Iqbal's idea that God embraces the finite egos in His being without obliterating their existence is also philosophical rather than Islamic. In support of this idea he states that fire causes iron to glow without robbing it of its separate entity and the light of the sun causes the light of the star to dwindle without tampering with stellar existence. The analogy of the sun and the star is rather unfortunate because there are stars bigger than the sun and the sun is the star nearest to the world. Moreover, Iqbal's idea that God embraces the finite egos in His being is reminiscent of Hindu mystic philosophers who postulated that God was like a pregnant woman holding the universe within

work out the spell of impressions into a coherent system of ideas, but it cannot shape our clay into an ideal human being. The intellectual self is only one aspect of the activity of our total self. The realization of the total self comes not by merely permitting the wide world to throw its varied impressions on our mind and then watching what becomes of us. It is not merely by receiving and intellectually shaping the impressions but mainly by moulding the stimuli to ideal ends and purposes that the total self of man realizes itself as one of the greatest energies of nature. In great action alone the self of man becomes united with God without losing its own identity, and transcends the limits of space and time. Action is the highest form of contemplation.

Lahore :
12 October, 1925

Books consulted for reference and editing.

1. The Meaning of the Glorious Koran : Pickthall.
2. Webster's Biographical Dictionary, 1958
3. Mathnavi translated into Urdu by Qazi Sajjad Hussain.
4. Ghazaliat-i-Naziri printed by Sh. Mubarak Ali, Lahore, 1920.
5. The Magazine of Islamia College, Lahore. "The Crescent".

Muhammad Siddiq

describes God as[1] كل يوم هو فى شان and fixes our gaze on change and variety as the greatest "signs" of God. Thus, the Quran has its own method for the elevation of the human self to the Divine standpoint. But I can only suggest this method in the following paragraph.

"The impulse which drives me into the wide world is precisely the same as that which drives so many into monasteries with a desire for self-realization". So says Count Keyserling[2] in his Diary recently translated into English. The Count is quite right. The world of matter which confronts the self of man as its 'other' is an indispensable obstruction which forces our being into fresh formations. I am afraid, however, that the Count's view of self-realization is one-sided. He tells us further: "I want to let the climate of the Tropics, the Indian mode of consciousness, the Chinese code of life, and many other factors which I cannot envisage in advance, to work their spell on me, one after the other, and then watch what will become of me." Now such a process may bring about the realization of our intellectual self. It may give us an acute thinker who can

---

1. The verse runs in the Holy Quran surah No. LV:55: 29 Al-Rehman, as follows:

يسئله من فى السموت و الارض ط كل يوم هو فى شان ،،

2. Keyserling, Count Hermann Alexander

German social philosopher and writer, lived in Paris and England (1903-1905), Berlin (1906-1907), and on estate in Estonia (1908) acquired admiration for Oriental philosophy; deprived of fortune and estate by Russian Revolution, settled in Darmastadt and lectured in many countries; U.S. (1928).

Works:

Reisetangebuch einse Philosopher 1919.

The next question is whether it is possible for the human observer to reach the Divine point of view, and to realise its freedom from the Universe as a confronting "other". The mystic says that it is possible to reach a super-intellectual standpoint, and his method is to escape from the conditions which make the movement of intellect possible. The mystic method has attracted some of the best minds in the history of mankind. Probably there is something in it. But I am inclined to think that it is detrimental to some of the equally important interests of life, and is prompted by a desire to escape from the arduous task of the conquest of matter through intellect -- the surest way to realise the potentialities of the world and to associate with its shifting actualities. I believe that Empirical Science--association with the visible---is an indispensable stage in the life of contemplation. In the words of the Quran, the Universe that confronts us is not" " It has its uses; and the most important use of it is that the effort to overcome the obstructions offered by it sharpens our insight and prepares us for an insertion into that lies below the surface of phenomena.

As the poet Naziri[1] says :-

نہ ہر مغزے کہ بوید نکہت از مصر و یمن گیرد
مشام تیز باید تا نصیب از پیرہن گیرد[2]

A keen insight is needed to see the non-temporal behind the perpetual flux of things. The mystic forgets that reality lives in its own appearances, and that the surest way to reach the core of it lies through its appearances. The Prophet of Arabia was the first to protest against this unhealthy Asiatic mysticism, and to open our eyes to the great fact of change within and without through the appreciation of which alone it is desirable to reach the eternal. The Quran

1. Naziri, Muhammad Hussain.
2. Ghazaliati Naziri pp :102 printed by Sh. Mubarak Ali, Lahore, 1920.

or something more substantial than a mere idea? The nature of self is such that it is self-centred and exclusive. Are, then, the Absolute Self and the human self so related to each other that they mutually exclude each other? Pringle-Pattison[1] deplores that the English language possesses only one word "Creation" to express the relation of God and the Universe on the one hand, and the relation of God and the self of man on the other. The Arabic language is, however, more fortunate in this respect. It has two words to express this relation, i.e, "Khalq" and "Amr". The former is used by the Quran to indicate the relation of the Universe of matter to God and the latter indicates the relation of the human self to the Divine self. All that we can say in answer to the extremely difficult question raised above is that the "Amr" is not related to God in the same way as the "Khalq" is. The "Amr" is distinct but not isolated from God. But I confess, I cannot intellectually apprehend this relationship any more than Rumi,[2] who says:-

اتصالے بے تخیل بے قیاس　　　ہست رب‌الناس را با جان ناس[3]

---

1. Seth, Andrew, Pringle--Pattison　　1856-1931

   Scottish philosopher, born in Edinburgh, on succeeding to Haining estate (1898), assumed additional surname Pringle---Pattison, Professor: Edinburgh (1891--1919). He wrote many books.

   Works:

   1. Hegelianism and Personality　　1887
   2. Man's Place in the Cosmos　　1897
   3. The Idea of Immortality　　1922

2. Rumi. September 30, 1207 ----- December 17, 1273.

3. The above mentioned verse is a misprint in "The Crescent". The correct verse runs as follows:

   اتصالے بے تکیّف بے قیاس　　　ہست رب الناس را با جان ناس

   Mathnavi tr. Urdu by Qazi Sajjad Hussain Vol.I. pp.24.

The object known, then, is relative to the observing self; its size and shape change as its position and speed change. But whatever the position and speed of the observer, whatever his frame of reference, something must always remain which confronts him as his 'other'. What does this mean? Does it mean that there is something absolute in what appears to us a objective reality? No. we cannot construe ever-present externality to mean the total independence or absoluteness of what appears as external to the self. Such an interpretation would contradict the very principle which discloses its relativity. If, then, in view of the principle of relativity, the object confronting the subject, is really relative, there must be some self to whom it ceases to exist as a confronting 'other'. This self must be a non-spatial, non-temporal Absolute to whom what is external to us must cease to exist and external. Without such an assumption objective reality cannot be relative to the spatial and temporal self. To the Absolute Self, then, the Universe is not a reality confronting Him as His 'other'; it is only a passing phase of His consciousness, a fleeting moment of His infinite life. Einstein is quite right in saying that the Universe is finite, but boundless. It is finite because it is a passing phase (in the Quaranic language) of God's extensively finite consciousness, and boundless because the creative power of God is intensively infinite. The Quranic way of expressing the same truth is that the Universe is liable to increase. The simple truth mentioned in the Quran was the greatest blow given to the deductive systems of thought that existed before Islam, and to the circular view of the movement of Time, common to all the Aryan modes of thought. But the age of the Quran was hardly ready to assimilate it.

We have seen that the Universe does not confront the Absolute Self in the same way as it confronts the human self. To Him, it is a phase of His consciousness; to us it presents itself as an independent reality. But is the human self also a phase of God's consciousness,

may say that it looks external because it is external. I do not contend this point. The star may be a reality situated outside me in an absolute space. My point is that if the account of perception given by modern science is correct, the star ought not to look external.

But is the thing known independent of the act of knowledge? Or, is the act of knowledge a constitutive element in the making of the object? Objective reality as understood by Physical Science is entirely independent of the act of knowledge. Knowing does not make any difference to it. It is there whether one knows it or not. In studying its behaviour, the act of knowledge can be ignored. Thus, Physics ignored Metaphysics in the sense of a theory of knowledge in its onward march. But this attitude of Physical Science, though highly advantageous to itself, could not have been maintained for a long time. The act of knowledge is a fact among other facts of experience which Empirical Science claims as its exclusive subject of study. Physics cannot afford to ignore Metaphysics. It must recognise it as a great ally in the organization of experience. Happily, it is not a Metaphysician but a Scientist who justifies Metaphysics--- I mean Einstein, who has taught us that the knower is intimately related to the object known, and that the act of knowledge is a constitutive element in the objective reality, thus confirming, in a sense, the idealistic position of Kant.[1] A further advance in our knowledge of the relationship between the act of knowledge and the object known will probably come from Psychology.

---

1 Kant, Immanuel 1724-1804.
German Metaphysician and transcendental philosopher born in Konigsberg, where he spent most of his life; founder of Critical Philosophy; educated as a priest (unit 1740) studied sciences, Mathematics, and Philosophy at University of Konigsberg (1740-46) and under private tutor (1747-54), Professor of Logic and Metaphysics: Konigsberg from (1770). Influenced by David Hume and English empiricists gradually developed his own critical philosophy.

Dr. Sir Sheikh Muhammad Iqbal

SELF IN THE LIGHT OF RELATIVITY

Allama Iqbal a great regard for Islamia College, Lahore. He rendered exemplary services to this institution. He taught twice in this college. He wrote his last will on October 13, 1935. According to this will, he donated all the books (in English) of his personal library to this educational institution. A separate section comprising these books of learning and wisdom was created in the library. It was named "Iqbal Collection", and is being used as a "Reference Library", even today. "Iqbal Collection" consists of 433 rare and valuable books.

Allama Iqbal also contributed to "The Crescent", the magazine of Islamia College, Lahore. The following essay is a reproduction in original from " The Crescent". It was sent to the editor on October 12, 1925, and published in December, 1925 issue, Vol. XX No.79.

Prof. Muhammad Siddiq

The ease with which we perceive external things hides from us the mystery of human perception. According to modern science, all that is necessary for an act of perception happens inside the observer; yet the thing perceived appears outside, and even at an enormous distance from the observer, as in the case of a star. If the star is a mere interpretation of the happenings within, then, why does it look external? You